ماہنامہ

حکمت بالغہ

مئی2010

مدیر: انجینئر مختار حسین فاروقی

قرآن اکیڈمی

جھنگ پاکستان

فون اور فیکس:-0092-47-77628261

ای میل:hikmabaalgha@yahoo.com

ویب سائٹ:http://jhanghikmat.co.cc یا

http://hamditabligh.net

فرمانِ خداوندی

سورة الطّلاق　　اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ　　(آیات 4-6)

(65)　　بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَ الّٰٓـئِىۡ يَئِسۡنَ مِنَ الۡمَحِيۡضِ

اور جو حیض سے نا اُمید ہو چکی ہوں

مِنۡ نِّسَآئِكُمۡ اِنِ ارۡتَبۡتُمۡ

تمہاری (مطلقہ) عورتیں اگر تم کو (ان کی عدت کے بارے میں) شبہ ہو

فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشۡهُرٍ

تو ان کی عدت تین مہینے ہے

وَ الّٰٓـئِىۡ لَمۡ يَحِضۡنَ

اور جن کو ابھی حیض نہیں آنے لگا (ان کی عدت بھی یہی ہے)

وَ اُولَاتُ الۡاَحۡمَالِ اَجَلُهُنَّ

اور حمل والی عورتوں کی عدت

اَنۡ يَّضَعۡنَ حَمۡلَهُنَّ

وضع حمل (یعنی بچہ جننے) تک ہے

وَ مَنۡ يَّتَّقِ اللّٰهَ

اور جو اللہ سے ڈرے گا

يَجۡعَلۡ لَّهٗ مِنۡ اَمۡرِهٖ يُسۡرًا O

اللہ اس کے کام میں سہولت پیدا کر دے گا

ذٰلِكَ اَمۡرُ اللّٰهِ اَنۡزَلَهٗۤ اِلَيۡكُمۡ

یہ اللہ کے حکم ہیں جو اس نے تم پر نازل کیے ہیں

وَ مَنۡ یَّتَّقِ اللّٰہَ

اور جو اللہ سے ڈرے گا

یُکَفِّرۡ عَنۡہُ سَیِّاٰتِہٖ

وہ اس سے اس کے گناہ دور کر دے گا

وَیُعۡظِمۡ لَہٗۤ اَجۡرًا O

اور اسے اجر عظیم بخشے گا

اَسۡکِنُوۡھُنَّ مِنۡ حَیۡثُ سَکَنۡتُمۡ مِّنۡ وُّجۡدِکُمۡ

(مطلقہ) عورتوں کو (ایام عدت میں) اپنے مقدور کے مطابق

وہیں رکھو جہاں خود رہتے ہو

وَ لَا تُضَآرُّوۡھُنَّ لِتُضَیِّقُوۡا عَلَیۡہِنَّ

اور ان کو تنگ کرنے کے لئے تکلیف نہ دو

وَ اِنۡ کُنَّ اُولَاتِ حَمۡلٍ

اور اگر وہ حمل سے ہوں

فَاَنۡفِقُوۡا عَلَیۡہِنَّ حَتّٰی یَضَعۡنَ حَمۡلَھُنَّ

تو ان کا خرچ دیتے رہو بچہ جننے تک

فَاِنۡ اَرۡضَعۡنَ لَکُمۡ

پھر اگر وہ بچے کو تمہارے کہنے سے دودھ پلائیں

فَاٰتُوۡھُنَّ اُجُوۡرَھُنَّ

تو ان کو ان کی اجرت دو

وَ اۡتَمِرُوۡا بَیۡنَکُمۡ بِمَعۡرُوۡفٍ

اور (بچے کے بارے میں) پسندیدہ طریق سے موافقت رکھو

وَاِنۡ تَعَاسَرۡتُمۡ فَسَتُرۡضِعُ لَہٗۤ اُخۡرٰی

اور اگر باہم ضد (اور نااتفاقی) کرو گے تو (بچے کو) اس کے (باپ کے)

کہنے سے کوئی اور عورت دودھ پلائے گی

لِيُنفِقْ ذُوْسَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ

صاحبِ وسعت کو اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرنا چاہیے

وَ مَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ

اور جس کے رزق میں تنگی ہو

فَلْيُنفِقْ مِمَّآ اٰتٰهُ اللّٰهُ

وہ جتنا اللہ نے اس کو دیا ہے اس کے موافق خرچ کرے

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰهَا

اللہ کسی کو تکلیف نہیں دیتا مگر اسی کے مطابق جو اس کو دیا ہے

سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا O

اور اللہ عنقریب تنگی کے بعد کشائش بخشے گا

صدق اللہ العظیم

مکالمہ بین المذاہب

مثبت پہلو کم اور منفی پہلو زیادہ

انجینئر مختار فاروقی

گزشتہ چند عشروں سے عالمی سطح پر INTER FAITH DIALOUGE کے نام سے عیسائیت، یہودیت اور اسلام کے ماننے والوں کے درمیان باہمی افہام و تفہیم کا ایک سلسلہ شروع ہے جس سے ابتدا میں یہ پیش نظر تھا کہ دنیا میں سائنسی ترقی کے نتیجے میں فاصلے کم ہو گئے ہیں ریڈیو، ٹی وی، اخبارات، ایس ایم ایس، موبائل فون کے ذریعے پیغامات اور گفتگو سے دوریاں ختم ہوگئی ہیں اب دنیا بھر کی خبریں ہر شخص تک جلد پہنچ جاتی ہیں پھر انٹرنیٹ اور E-mail نے تو انقلاب برپا کر دیا ہے، کاروباری معاملات میں پہلے رقم کا لین دین ہی تاخیر کا سبب بنتا تھا اب E-Banking سے یہ معاملہ بھی رکاوٹ نہیں رہا اور رقم کا ایک براعظم سے دوسرے براعظم منتقل کر دینا اب چند سیکنڈوں میں ممکن ہو جاتا ہے۔

ان حالات میں جبکہ دنیا کے ممالک ــــــــــــ ایک گاؤں کے گھروں سے زیادہ قریب آ گئے ہیں اور دنیا کو بجا طور پر ایک GLOBAL VILLAGE کہا اور سمجھا جا رہا ہے ــــــــــــ مگر فکری اور مذہبی سطح پر مختلف مذہب اور معاشروں میں بہت ذہنی اور فکری بُعد پایا جاتا ہے اور لوگ اکٹھے مل بیٹھتے ہیں ایک جگہ رہتے ہیں ایک دفتر میں کام کرتے ہیں آپس میں کاروباری روابط ہیں۔ مگر فکری اور نظریاتی بُعد کی بنا پر قریب نہیں آ سکتے۔ یہاں مذہب مذہبی

تعلیم نظریہ رسوم و رواج، ثقافت، تہذیب روایات کو بہت دخل ہے اور یہی چیز بظاہر عالمی سطح پر معاشروں اور تہذیبوں کے ایک دوسرے کے قریب آنے میں مانع ہے۔

مکالمہ بین المذاہب یا INTERFAITH DIALOUGE کے مقاصد اس صورتِ حال کو باہمی احترام اور آزادی رائے، آزادی مذہب اور بنیادی انسانی حقوق کے متفقہ عالمی اصولوں کے تحت صحیح سمت میں آگے بڑھانے کے لئے موزوں ماحول اور سازگار ذہنی نشو ونما فراہم کرنے کے ہیں۔

(i) عالمی سطح پر مختلف مذاہب کے رہنماؤں کے درمیان باہمی ملاقاتیں اور مختلف انداز کی تقاریب میں اکٹھے ہونا تاکہ قریب آکر ایک دوسرے کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

(ii) مذاہب عالم کے رہنماؤں میں باہمی روابط استوا ہوں گے اور INTERACTION ہوگا تو سب سے پہلے ایک دوسرے کے بارے میں صدیوں پرانی غلط فہمیاں، روایات اور مفروضے دوبارہ تازہ کر کے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر پرکھنے (EVALUATE) کا موقع ملے گا اور یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ بے بنیاد اور غلط معلومات کی بنیاد پر گھڑے گئے تصورات ــــــــــ جلد یا بدیر ختم ہوجائیں گے اور جیسے ذاتی انسانی زندگی کے تجربات ہیں اسی طرح اجتماعی سطح پر مکالمہ بین المذہب کے نتیجے میں سامنے آنے والے بعض بے بنیاد تصورات کی وجہ سے صدیوں ایک دوسرے کے جانی دشمن بنے رہنے پر شاید انسان کو ہنسی آجائے۔

(iii) مذاہب عالم کے پیروکاروں میں بالعموم یہ تصور پایا جاتا ہے کہ ان کی سوچ اور تشریح ہی حتمی اور صحیح ہے نیز کائنات کے آغاز وانجام، انسان کا مقدر، حیات دنیوی، موت اور مابعد الموت کے بارے میں صرف ہمارے ہی وضع کردہ قواعد وضوابط حتمی اور 'حق' ہیں۔ اس صورت حال کو بنیادی اصولوں کی روشنی میں فراخ دلی اور تحمل کے ساتھ غور کر کے حق کو حق اور باطل کو باطل کے طور پر الگ الگ کر دینا ایک کٹھن اور نہایت ہی مشکل کام ہے جس سے ایک باضمیر اور اخلاقی لحاظ سے اعلیٰ حیثیت کا مالک انسان ہی سرخرو ہو کر نکل سکتا ہے تاہم یہ کام ناگزیر حد تک ضروری ہے۔

مکالمہ بین المذ ہب سے اس قسم کا علمی، اخلاقی اور اعلیٰ ظرفی کا ماحول پیدا ہو جانا بعید تو نہیں ہے تاہم انگریزی محاورے میں NEXT TO IMPOSSIBLE ہے یا 'معجزہ' ہے اور معجزے روز روز رونما نہیں ہوتے۔ مکالمہ بین المذ اہب کے اس ماحول میں باہمی ملاقاتوں اور میل جول (INTERACTION) سے شاذ ہی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی حق پرست حق کو قبول کر لے

(iv) مکالمہ بین المذ اہب کے ذریعے مذہبی رہنما اور علماء آپس میں ملیں گے تو اس کو ایک عکس عوامی سطح پر بھی پڑتا ہے اور عوام میں بھی باہمی رواداری کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور اگر اوپر کی سطح پر خلوص و اخلاص کا سرمایہ ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ احترام باہمی کا یہ جذبہ عوامی سطح پر بھی سرایت نہ کر جائے۔

(v) مکالمہ بین المذ اہب کے نتیجے میں ایک دوسرے کے خیالات و نظریات پر 'حق کی تلاش' اور 'حقیقت تک رسائی' کی نیت سے غور و فکر کرنا اور اس ضمن میں میسر تحریری مواد کے ساتھ ساتھ اس مذہب کے پیروکاروں کا اخلاق اور کردار بھی سامنے رکھ کر کوئی نتیجہ نکالنا آسان ہے اور اس سے بھی باہمی احترام میں اضافہ ہوگا۔

اوپر درج چند نکات اور اس کے علاوہ بھی کئی پہلو ہو سکتے ہیں جو مکالمہ بین المذ اہب کے نتیجے میں خلوص و اخلاص کے ساتھ سامنے آسکتے ہیں اور اس کا مجموعی طور پر سیکولرازم کے مقابلے میں 'مذہب کی طرف آجانے' کے ضمن میں مثبت نتیجہ سامنے آسکتا ہے۔

مکالمہ بین المذ اہب کی بات اگر نیک نیتی سے شروع ہو کر یہاں تک بھی آجائے تو یہ انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہے اور حق کے متلاشیوں کے لئے روشنی کا مینار ہے اور اس کاوش کے یہی مثبت پہلو ہیں جن سے انکار ممکن نہیں ہے اور اس سطح پر اس مکالمہ کی حمایت ہی کی جاسکتی ہے اور آگے بڑھنے کے لئے بامعنی کوششیں بھی از حد ضروری ہیں۔

مکالمہ بین المذ اہب کے مثبت پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس کام اور جدوجہد میں کئی منفی پہلو بھی ہیں ان کو اہمیت نہ دینا اور نظر انداز کر دینا پرلے درجے کی حماقت سے کم نہیں ہے، اس بات کی وضاحت کے لئے دلائل دینے سے قبل ایک مثال سے حقیقی صورت حال کو سمجھنے میں (شاید) مدد مل سکے اور وہ یہ ہے:

کسی جگہ دو آدمی، دو خاندان (یا دو ملک یا قومیں) اپنے کسی اختلاف کی بنیاد پر لڑ پڑیں

اور بات تو تکار سے بڑھ کر بحث مباحثہ اور پھر لڑائی تک آجائے اور قتل و غارت تک معاملہ پہنچ جائے تب بھی اہل علم و دانش جانتے ہیں کہ وہ دونوں فریق جلد یا بدیر کسی درمیانی راہ یا صلح پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ ہر قوم اور گروہ میں جہاں شیر اور HANKS ہوتے ہیں وہاں DOVES اور صلح جو لوگ بھی ہوتے ہیں

مگر ــــــــــــ بدقسمتی سے کسی ایک فریق یا دونوں فریقوں کے پیچھے کوئی اور خفیہ ہاتھ ہو یا کوئی صاحب حیثیت آدمی ہو تو یہ بات باور کی جاسکتی ہے کہ دونوں فریقوں میں کبھی صلح نہیں ہو سکتی اور جب تک اس خفیہ طاقت کا 'مفاد' رہے گا وہ قضیہ یا جنگ یا اختلاف جاری رہے گا۔

بعینہٖ یہی صورتحال آج کے عالمی حالات کے تناظر میں بچشم سر دیکھی جاسکتی ہے اور مغرب کے ہر اقدام کے پیچھے محسوس کی جاسکتی ہے۔ اور یہی ــــــــــــ کیفیت مکالمہ بین المذاہب کی مہم کے ضمن میں ذرا سے غور و فکر سے سمجھ میں آسکتی ہے۔

آج کے عالمی حالات ہوں یا ملکوں کے داخلی تنازعات سیاست ہو یا معیشت مذہبی اختلافات ہوں یا نسلی امتیازات ایک عالمی طاقت ــــــــــــ صہیونی اور ابلیسی طاقت اس کو ایک ہتھیار (TOOL) کے طور پر عرصے سے استعمال کرتی چلی آرہی ہے۔ علامہ اقبال نے ایک صدی قبل فرمایا تھا۔ ع فرنگ کی رگ جان پنجہ یہود میں ہے

اور امریکی سیاستدان بنجمن فرینکلن نے ڈیڑھ صدی قبل کہا تھا کہ یہود کو امریکہ سے نکال دیا جائے یہ لوگ جس ملک میں گئے ہیں اسی ملک کو انہوں نے تباہ ہی کیا ہے اور بالآخر امریکہ کو بھی اپنے مفاد کی خاطر تباہ کر دیں گے۔

یہود مشرقی یورپ سے یکے بعد دیگرے اپنے سازشی کردار کی وجہ سے نکالے گئے اور دوسری جنگ عظیم کے دوران مشہور عام مرگ انبوہ یا (HOLOCAUST) میں ہٹلر کے ہاتھوں لاکھوں کی تعداد میں مارے گئے ــــــــــــ مگر ابھی تک یہ قوم شرارتوں سے باز نہیں آئی اور تاریخ سے اس نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔

اور بالخصوص ــــــــــــ یہ ابلیسی گروہ مسلمانوں اور پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کے خلاف حد درجہ بغض و عناد رکھتا ہے آپ ﷺ کی حیاۃ طیبہ کے دوران بھی اور آج تک اس نے ہمیں

معاف نہیں کیا اور کوئی موقع ہاتھ سے جانے دیا کبھی پیغمبر اسلام کے خاکے بنائے جاتے ہیں (معاذ اللہ) کبھی جہاد کو نشانہ تنقید بنایا جاتا ہے کبھی آپ ﷺ کے تعدد ازواج پر ناروا زبان طعن دراز کی جاتی ہے۔

عالمی سطح پر اس خفیہ ہاتھ کے خوفناک منصوبے اور مضحکہ خیز کاروائیاں ایسی ہیں کہ بظاہر مخالف و متضاد روّیے اور مظاہر ہوتے ہیں مگر تلاش کریں تو اس کے پیچھے کارفرما ہاتھ ایک ہی نظر آئے گا۔ یہ خفیہ ہاتھ چاہتے ہیں کہ مکالمہ بین المذاہب بھی ہوتا رہے اور اس کے فوائد بھی یہ گروہ سمیٹتا رہے اور اس طرح قریب لا کر دینا بھر کے عوام کو مذہب سے بدظن کر کے اور مذہبی لوگوں کو دہشت گردی کا علمبردار ظاہر کر کے سیکولرازم کو ذہنوں میں اتار دے اور سیکولرازم کے پیچھے چھپے صہیونی عزائم کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جائے۔

ایک طرف مکالمہ بین المذاہب ہے اور دوسری طرف یہی خفیہ ہاتھ پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کے بار بار کارٹون بنا کر مغربی میڈیا میں عام کر رہا ہے ان دونوں کاروائیوں میں قدر مشترک تلاش کریں تو سوائے اس کے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا کہ ایک خفیہ ہاتھ ہے جو مکالمہ کا سلسلہ بھی جاری رکھنا چاہتا ہے اور اس کی کامیابی کو روکنے کے لئے مغربی دنیا (عیسائیوں) اور مسلمانوں میں نفرت کو کم ہونے بھی نہیں دینا چاہتا۔ اس لئے کہ مکالمہ کے ذریعے مسلمان اور یہود نہ سہی مسلمان اور عیسائی ہی قریب آ جائیں تو یہود کے لئے موت کا پروانہ ہے۔

انہی خفیہ ہاتھوں کی طرف ایک مزید اشارہ بھی نفس مضمون کو سمجھنے کے لئے ممد و معاون ہوگا۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کے فرضی خاکوں اور توہین آمیز مضامین کا معاملہ دیکھیں اس کے پیچھے کارفرما در پردہ ہاتھ صرف مسلمانوں ہی کے خلاف ہیں ورنہ حضرت محمد ﷺ کی شخصیت تو ''بے عیب'' ہے اور ان کے کردار پر کوئی شخصی بقائمی ہوش و حواس انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ یہ خفیہ ہاتھ بھاری رقمیں خرچ کر کے اور قلمکاروں، ادیبوں اور کارٹونسٹ کے ضمیر ڈالروں میں بھاری قیمت ادا کر کے خریدتے ہیں اور یہ ''غلیظ'' حرکتیں کراتے ہیں۔

اگر یہ قلمکار' کالم نگار ادیب اور اور کارٹونسٹ از خود یہ کام کرتے ہوں تو سو سوا سو سال پہلے برطانوی ہند میں ایک خود ساختہ نبی (مرزا غلام احمد قادیانی) اٹھا تھا اور اس کا کردار اس کی اپنی کتابوں کے آئینے میں مغربی پیمانوں میں بھی کسی طرح ایک ''شریف انسان'' کا کردار نہیں ہے

اور مغربی دنیا اور وہ گروہ خود بھی اپنے آپ کو مسلمانوں میں شامل کئے رکھنے پر مصر ہے (اگر چہ پاکستان سمیت کئی مسلم ممالک میں احمدی 1974ء سے پارلیمنٹ کے ذریعے غیر مسلم قرار دیئے جا چکے ہیں۔ حیرانی کی بات ہے اس ''مارڈن'' دجال اور نبوت کے دعوے دار شخص کے خلاف کبھی کوئی تحریر یا کارٹون مغربی پریس میں نہیں آیا ــــــــــ اس کی وجہ دماغ پر زور دے کر تلاش کریں سوائے اس کے کوئی نہیں ہو سکتی کہ عصر حاضر کا یہ خود ساختہ نبی ــــــــــ دراصل انہیں خفیہ ہاتھوں کا ''خود کاشتہ پودا'' ہے۔

یہ اور اس طرح کی مثالیں ــــــــــ دیدہ بینا ہو ــــــــــ اور سماعت و بصارت پر پردے نہ پڑے ہوں تو چہار سو پھیلی پڑی ہیں۔ یہی کاروائیاں دراصل مکالمہ بین المذاہب کی آڑ میں منفی پہلو ہیں جن کی دو مثالیں آپ کے سامنے رکھی ہیں ۔ مکالمہ بین المذاہب کے منفی پہلو پر بات تفصیل طلب ہے ان شاءاللہ آئندہ کسی تحریر میں اس پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالیں گے۔

معروف مذہبی مصنف اور کثیر اہم مذہبی کتابوں کے مؤلف سید قاسم محمود صاحب یکم اپریل 10ء کو اس دار فانی سے رحلت فرما گئے مرحوم کی عمر 85 سال کے لگ بھگ تھی آخری عمر تک صحت اچھی تھی تاہم ــــــــــ اجل سے کسی متنفس کو استثنا نہیں۔ قارئین حکمت بالغہ کے لئے ان کا نام نیا نہیں ہے۔

سید قاسم محمود صاحب نے ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ علم وفن کی مثبت انداز میں خدمت کی ہے شاہکار' کتابیں، اسلامی انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا اور مسلم سائنسدانوں کے حالات و انکشافات پر کئی ضخیم کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ سیارہ ڈائجسٹ کی ادارت کے زمانے میں قرآن نمبر اور رسول ﷺ نمبر وغیرہ بھی ان کی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے قلبی لگاؤ کے مظہر ہیں۔ چند ماہ پہلے ایک ملاقات میں انہوں نے قرآن اکیڈمی جھنگ تشریف لانے کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا مگر اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا حکمت بالغہ کے اجراء پر اور اس کے مضامین پر وہ حوصلہ دلاتے رہتے تھے۔ ان کے کام کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ اکیلے اتنا کام کیسے سرانجام دے لیتے تھے۔

ان کی آخری خواہش اور کاوش انسائیکلو پیڈیا قریانیات تھی جیسے وہ مکمل نہ کر سکے۔انہوں تن تنہا اتنا کام کیا جتنا بڑے بڑے ادارے وافر وسائل کے ساتھ بھی نہیں کر سکتے۔ایران کے ملک الشعراء بہار کے بقول

ع واحدے کز صد ہزاراں برگذشت

اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور قبر میں بھی کروٹ کروٹ آرام وسکون عطا فرمائے۔(آمین)

يعزّون عنك و كيف العزاء ۔ ولكنه عمل مستحب

ادارہ مرحوم کے پس ماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔اللہ تعالیٰ انہیں صبر جمیل عطا فرمائے۔(آمین)

مجدد تبلیغ

حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ

(1886ء/1303ھ ــــ 1944ء/1363ھ)

انجینئر مختار فاروقی

آپ دہلی میں مولانا محمد اسماعیل رحمہ اللہ صاحب کے ہاں 1886ء (1303ھ) میں پیدا ہوئے، ان دنوں آپ کے بڑے بھائی مولانا محمد یحییٰ گنگوہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ آپ کے والد گرامی نے 1898ء (1315ھ) میں وفات پائی تو بھائی ان کو اپنے ساتھ گنگوہ لے گئے اور ابتدائی تعلیم بڑے بھائی سے ہی حاصل کی۔ گنگوہ ان دنوں اکابر علماء اور مجاہدین کا گہوارہ تھا۔ آپ نے اس ماحول میں تربیت پائی اور دین کے کام کی تڑپ، جدوجہد اور احیائے اسلام کی لگن جیسے جذبات سے خوب حصہ پایا۔ آپ نے مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بچپن میں ہی بیعت کر لی تھی۔

آپ نے دیوبند میں حضرت شیخ الہند محمود حسن رحمہ اللہ سے بھی تحصیل علم کی۔ پہلے مظاہر العلوم سہارن پور میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، پھر 1911ء میں بڑے بھائی مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی کی وفات کے بعد دہلی منتقل ہو کر والد گرامی کی مسند سنبھال لی۔ آپ کے آباو اجداد جھنجھانہ سے تعلق رکھتے تھے والد گرامی کاندھلہ میں شادی کی بنا پر کاندھلوی مشہور ہوئے اور آپ دہلی میں تبلیغی سرگرمیوں کی بنا پر محمد الیاس دہلوی کہلائے۔ آپ کی وفات جولائی 1944ء (1363ھ) میں ہوئی۔

دہلی صدیوں سے حکمرانوں کا مسکن اور اہل علم وفن کا گہوارہ رہا ہے۔ مسلمان حکمرانوں نے بھی اسے اپنا دارالسلطنت بنائے رکھا ہے۔ یہاں علم کے سینکڑوں مراکز، بے شمار علماء، فضلاء اور صوفیاء پیدا ہوئے اور اپنی بساط کے مطابق اشاعت علم دین میں وقت گزارا۔ تاہم ــــــــــــ نیز نگی افلاک دیکھئے کہ دہلی اور اس کے آس پاس کا دیہاتی علاقہ (بے شمار دوسرے علاقوں کی طرح) کے عوام ماضی میں کلمہ اسلام پڑھ کر دائرہ اسلام میں آجانے کے باوجود اسلام کی ابدی تعلیمات سے بے بہرہ رہے۔ کئی نسلوں سے علم دین سے محرومی کی بنا پر ان علاقوں کے لوگوں کی کثیر تعداد مسلمان کہلانے کے باوجود کلمہ اسلام بھی صحیح طریقے پر نہیں پڑھ سکتے تھے۔

مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ کے والد گرامی نے (1860ء کے بعد) بستی نظام الدین میں رہائش کر کے مسجد تعمیر کی تو نمازیوں کو تلاش کرنا پڑا یہیں سے تبلیغ دین کا جذبہ پیدا ہوا۔ مدارس کا قیام اور علوم دینیہ کی تعلیم و تدریس ایک اور شعبہ ہے، علماء دین کی کھیپ تیار کر دینا بالکل دوسری بات ہے اور عوام میں اسلامی تعلیمات کو عام کرنا ایک بالکل علیحدہ شعبہ ہے۔ آپ کے والد گرامی نے عوامی سطح پر میوات کے مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کا بڑا کام کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے ثمرات بھی عطا فرمائے۔

یہی دور ــــــــــــ وہ دور ہے جب 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمان اگلے مرحلہ کی تیاری کر رہے تھے جبکہ ہندو برطانوی استعمار سے ٹکرانے کی پالیسی کی بجائے ابتداء ہی سے مفاہمت کی پالیسی اختیار کئے ہوئے تھا۔ اس طرح ہندو نو وارد حکمرانوں کو سہارا دے کر ان سے مراعات بھی حاصل کر رہا برطانوی سامراج نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی؛ لہٰذا مسلمانوں اور سات سمندر پار کے غاصب حکمرانوں میں اختلافات کی خلیج حائل تھی اور تصادم کا معاملہ تھا جو 1857ء کے بعد بظاہر دب گیا تھا مگر ــــــــــــ ع ''آگ دبی ہوئی سمجھ، بجھی ہوئی نہ جان'' کے مصداق وہ جذبہ ختم نہیں ہوا تھا۔ ہندو مرہٹہ قوت میں مسلم دشمنی کے انتقامی جذبات بھی پروان چڑھ رہے تھے اور انگریز کے زیر سایہ برطانوی ہند میں اندلس (سپین) کی طرح مسلمانوں کی بیخ کنی کا منصوبہ آگے بڑھا رہے تھے۔ برہمو سماج کی تحریک تو تھی ہی، شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع ہوئیں کہ ہند میں آباد مسلمانوں کی اکثریت مقامی قبائل سے مسلمان

ہوئے ہیں لہٰذا انہیں واپس ہندو بنا لینا چاہیے۔ یہ بڑی خوفناک تحریکیں تھیں اگر دست قضا مسلمانوں میں بعض اہم شخصیات کے ذریعے شجر اسلام کی آبیاری کا کام نہ لے لیتا تو یہ اسلام کا شجر سوکھ چکا ہوتا انہیں شخصیات میں اہم نام مولانا محمد الیاس دہلوی رحمہ اللہ کا ہے۔

آپ نے نام کے مسلمانوں کو حقیقی مسلمان بنانے کا عزم کیا اور ان میں دین کی عظمت، اسلامی تعلیمات اور فرائض کا علم اور دین کے لئے جان و مال سے محنت (جہاد) کا جذبہ پیدا کر دیا اور تبلیغ کے نام سے ایسی جدوجہد کی کہ نصف صدی بعد وہ تحریک ایک تن آور درخت بن کر عالمی تحریک بن گئی۔

اس تبلیغی کام کی ابتدائی اُٹھان اسلام کے ابدی اور آفاقی اصولوں پر ہوئی تھی۔ مسلمانوں کو بیدار کرو ــــــــــ قرآن مجید کی تعلیمات عام کرو ــــــــــ جذبہ جہاد پیدا کرو ــــــــــ آگے بڑھ کر اسلام کو غالب کر کے ایک اسلامی خلافت کی بنیاد رکھ دو ــــــــــ اس لئے کہ خلافت کے قیام کے بغیر اور ایک علاقہ فتح کر کے اس میں اسلامی تعلیمات کو رائج کئے بغیر مسلمان پورے دین پر کبھی عمل نہیں کر سکتے۔

مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ کی سوچ ان کے خطابات سے واضح ہے اور ان کی تبلیغی مساعی اور کاموں سے ظاہر ہے ان کا ایک خطبہ جو بحمد اللہ مطبوعہ موجود ہے اور پہلے تبلیغی نصاب کے ساتھ چھاپا جاتا تھا ہماری مراد ''مسلمانوں کی موجودہ پسی کا واحد علاج'' نامی تحریر ہے جو مولانا الیاس رحمہ اللہ کی ایک تقریر کو نقل کر کے انہیں کے ایک عزیز اور عقیدت مند مولانا احتشام الحسن کاندھلوی رحمہ اللہ نے شائع کرائی تھی۔ اس تقریر میں آپ نے اپنے تبلیغی کام کا سارا صغریٰ کبریٰ اور اپنی مساعی کا ابتدائی مرحلہ، آگے کے مراحل اور آخری مراحل کا بھی اشارہ دیا ہے۔ ہم یہاں اس تحریر کی اہمیت کے پیش نظر من وعن اسی شمارہ میں علیحدہ شائع کر رہے ہیں تاکہ قارئین کرام مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ کی تبلیغی مساعی کے ساتھ ان کے اعلیٰ فکر اور غلبہ اسلام کی تڑپ کا اندازہ کر سکیں۔

☆ آج کی تبلیغی جماعت کے اکابرین و صاغرین اسلام کے غلبہ کو اس طرح اہمیت سے بیان نہیں کرتے جس کا یہ بیان متقاضی ہے یہ اشارہ ہے جماعت کے اہداف میں تبدیلی کا۔ اللہ کرے ایسا نہ ہو اور ہمارا مشاہدہ صحیح نہ ہو اور جماعت تبلیغ کے اکابرین اور اصاغرین سب اسلام

کے غلبہ کو اپنا مطمع نظر سمجھتے ہوں اور قیام خلافت کے ذریعے ایسا ماحول پیدا کرنے کو بھی اپنا فریضہ سمجھتے ہوں جس کا تذکرہ سورہ نور کی آیات 57 میں آیا ہے اور جس کے بغیر مسلمان پورے دین پر عمل پیرا نہیں ہو سکتے اور نہ عوام کو اسلامی تعلیمات کی برکات مل سکتی ہیں۔

مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ کی اسی انقلابی کی سوچ کے بارے میں سید قاسم محمود صاحب اسلامی انسائیکلوپیڈیا میں رقم طراز ہیں:

''مولانا کا اس کام کے بارے میں نقطہ نظر بہت بلند تھا، ان کے سامنے صرف اتنی سی بات نہ تھی کہ عوام الناس نماز، روزہ سیکھ جائیں اور ذکر واذکار کے پابند ہو جائیں بلکہ مولانا پوری ملت اسلامیہ کو بیدار کر کے انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی تک کو اسلامی بنانے کی فکر رکھتے تھے۔ خود مولانا کے الفاظ ہیں:

''ہماری اس تحریک کا اصل مقصد یہ ہے: اسلام کے پورے علمی و عملی نظام سے امت کو وابستہ کر کر دینا۔ رہی قافلوں کی یہ چلت پھرت اور تبلیغی گشت، سو یہ اس مقصد کے لئے ابتدائی ذریعہ ہے اور کلمہ و نماز کی تلقین و تعلیم گویا ہمارے پورے نصاب کی ا، ب، ت ہے''۔

جناب سید قاسم محمود صاحب مزید رقم طراز ہیں:

''مولانا نے 1330ھ/1916ء میں نکاح کیا تھا۔ اولاد میں ایک صاحبزادہ مولانا محمد یوسفؒ اور ایک دختر تھی جو مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ سے بیاہی گئیں۔ مولانا پست قد تھے، گندمی رنگ اور دبلا جسم تھا، داڑھی گھنی تھی، زبان میں قدرے لکنت، آواز پر جوش، طاقتور اور عالی ہمت کہ تبلیغ کے سلسلے میں پہاڑیوں پر چڑھتے، تیز دھوپ اور گرم لُو برداشت کرتے، مئی جون کی گرمی میں میوات کا دورا کرتے، سخت سردیوں میں شہر شہر اور گاؤں گاؤں پھرتے''۔

مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ نے تبلیغ کے اس کام میں مجددانہ اصلاحات فرمائیں روایتی مذہبی تبلیغ، تبلیغی کانفرنسیں عام طور پر اختلافی مسائل پر اپنے ہم خیال عوام کے سامنے علماء کا اپنے نظریات کا دوبارہ اظہار کرنا ہوتا ہے اور علماء کرام اس کام کے لئے بھاری بھاری معاوضے وصول

کرتے ہیں۔مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ نے تبلیغ دین کے لئے پیغمبرانہ شان کے ساتھ کام کیا اور اس کو عام کرنے کی کوشش فرمائی کہ تبلیغ دین کے لئے اپنی جیب سے خرچ کرو، اپنا بستر خود اٹھاؤ اور اپنے کام خود کرو اور عوام تک جا کر دین پہنچاؤ۔اس کام کی یہ شان تھی کہ انہیں تبلیغ کے شعبہ کا مجدد کیا جانا ان کے شایان شان ہے۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو انہیں جیسا جذبہ نہ سہی ان کے جذبہ کا کوئی حصہ ہی عطا فرمادے (آمین)

یہ سیمینار 6 جنوری 2008ء بروز اتوار کو منعقد ہوا تھا۔ اس میں معروف علماء، فضلاء، پروفیسرز اور وکلاء حضرات نے حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ کے حالات زندگی پر اظہار خیال فرمایا تھا۔ پروگرام 9:00 بجے تا 12:00 بجے جاری رہا اور سامعین نے نہایت دلچسپی سے اس کو سنا اور سراہا۔

بہبود آبادی اور خاندانی منصوبہ بندی کے نام پر امداد کے روپ میں

اقوام مغرب کا دوسروں کو دھوکا

اور ترقی یافتہ ممالک کی تہذیب کو تباہی کا سامنا

انجینئر مختار فاروقی

بہبود آبادی اور خاندانی منصوبہ بندی کے نام پر گزشتہ نصف صدی میں نام نہاد ترقی یافتہ اقوام مغرب نے خود براہِ راست اور صہیونی ادارہ اقوام متحدہ کے ذریعے جس طرح ترقی پذیر ممالک کو بے وقوف بنایا ہے وہ بڑی دردناک اور المناک داستان ہے۔ جیسے انفرادی طور پر کسی شخص کو دھوکہ دینے کے لئے اس سے دوستی کی آڑ میں اور اس کی بہتری، اصلاح اور بے لوث خدمت کا روپ دھار کر واردات کی جاتی ہے بعینہٖ اسی طرح مغربی اقوام نے خود فریبی کے تحت یا جان بوجھ کر براہ راست امداد کے نام پر بھی اور اقوام متحدہ جیسے بظاہر اجتماعی فلاحی ادارہ کے ذریعے بھی پسماندہ اقوام کو فنا کرنے اور ان کا نام ونشان مٹانے کے پروگرام پر عمل درآمد آج تک جاری رکھا ہوا ہے۔ یہ نیرنگئ قدرت ہے کہ غیر ترقی یافتہ اقوام کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ تو ہوا ــــــــــ اس کا مداوا تو وقت کے ساتھ ساتھ ہوگا ــــــــــ مگر خود اقوام مغرب اس اپنے ہی تیار کردہ جال کے پھندے میں پھنس چکی ہیں اور شاید یہ صورت ناقابل اصلاح حد تک آگے جا چکی ہے کہ اقوام مغرب کی تہذیبی خودکشی کو روکنا کسی ادارے کے بس میں نہیں ہے۔ معدودے چند دانشور اور باضمیر لوگ اس پر واویلا کر رہے ہیں جس کے سوا اب کیا بھی کچھ نہیں جا سکتا۔ امریکہ میں حال ہی میں سپریم کورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج نے کتاب لکھی ہے جس میں اقوام

مغرب اور بالخصوص امریکہ (جو اقوام مغرب کا نمائندہ اور تہذیبی لحاظ سے ماسٹر مائنڈ ہے) کے تباہ حال معاشرے کی اخلاقی گراوٹ کا رونا رویا گیا ہے۔ کتاب کا نام "SLOUCHING TOWARDS GOMORRAH" ہے اور مصنف کا نام ROBERT H.BORK ہے۔عنوان کا ترجمہ ہے ''امریکی عوام کا قومِ لوط (علیہ السلام) جیسے انجام کی طرف تیزی سے لپکنا'' ہے اور اس میں امریکی معاشرے کی اخلاقی گراوٹ کا نقشہ خود وہیں کے ایک شخص نے کھینچا ہے۔ اس طرح کی سوچ کے حامل معدودے چند لوگ ہیں جو وہ اپنی قوم کو آنے والی تباہی سے ڈرا رہے ہیں۔ اس ڈرانے کا نتیجہ کوئی 'اصلاح' ہو سکتی ہے یا نہیں یہ بظاہر ناممکن نظر آ رہا ہے۔

مغرب کی سائنسی ترقی کا عمل آج سے پانچ صدیوں پہلے شروع ہوا پہلے اس کا مرکز یورپ تھا بعد ازاں یہ مرکز امریکہ منتقل ہو گیا۔ اہل علم جانتے ہیں کہ موجودہ مغربی ترقی اور عروج کے پیچھے در پردہ صہیونیت کا گہرا ہاتھ ہے اور اس استحصالی نظام کا سارا فائدہ یہی گروہ اٹھا رہا ہے۔

ان سطور میں ہمیں اس وقت اس صہیونی طاقت اور مافیا کا تذکرہ نہیں کرنا ہے بلکہ صرف اس قدر توجہ دلانا کافی ہے کہ سائنسی ترقی اور تجرباتی علوم کے انکشافات و اکتشافات کی فراوانی مغربی عروج کا ایک اہم حصہ ہے اور اس میں اختلاف بہت کم ہے اور یہ قابل قدر مشترکہ انسانی ورثہ ہے جس کی تعریف نہ کرنا کم ظرفی ہے۔ تاہم ———— اس تحقیق و جستجو کے نتائج اور تسخیر کردہ قوائے فطرت کو قابو کر کے ان کا استعمال جن مقاصد کے لئے ہو رہا ہے اور عالمی سطح پر ایک ہی سوچ اور انداز فکر کو پروان چڑھایا جا رہا ہے وہ صہیونیت کا ایجنڈا ہے اور ترقی یافتہ اقوام کے سب لوگ اُن کے آلہ کار ہیں۔

اگر دنیا میں صورت حال یہ ہوتی کہ ان سائنسی اکتشافات کو مسلمان ممالک الگ انداز میں آگے بڑھاتے، ہندو اپنے ملک بھارت میں اپنے انداز میں ان ایجادات کی بنا پر فلاحی ریاست کے لئے اقدامات کرتے ہیں، عیسائی ممالک اپنے انداز میں، بدھ مت کے پیروکار اپنے نقطہ نظر سے ان حقائق کی روشنی میں انسانی فلاح و بہبود کے منصوبے بنا کر فلاحی مملکت بنا دیتے تو اس شعبے میں مسابقت ہوتی اور خوب سے خوب تر کی جستجو کا ماحول قائم رہتا......مگر بُرا ہو اس صہیونی

ذہن کا جس نے ان ایجادات کو ہر ممکن طریقے سے 'یہودی' ملکیت میں رکھا، بڑی ایجادات 'یہود' ہی کے نام منسوب کیں اور نوبل پرائز کے ایوارڈ بھی دیے تو صرف یہود کو یا یہود کے آلہ کار افراد کو۔ ایک سیکولر عالمی سوچ مادر پدر آزاد رویے اور خدا بیزاری اور خدا دشمن سوچ کو فروغ دیا تا کہ دنیا کو اپنے انداز میں ڈھال کر ایک IMMORAL اور VALUELESS سوسائٹی کا قیام عمل میں آ جائے۔ پہلے یہ امریکہ میں ممکن ہوا وہاں 1776ء میں ORDO NOVO SECLORUM کا نعرہ بلند کیا گیا ــــــــ پھر یورپ میں اور اب عالمی سطح پر یہی سوچ چھا چکی ہے اور پس ماندہ اقوام اس آگ میں جل رہی ہیں۔ علامہ اقبال نے ایک صدی پہلے جواب شکوہ میں فرمایا تھا:

عہدِ نو برق ہے' آتش زن ہر خرمن ہے ایمن اس سے کوئی صحرا' نہ کوئی گلشن ہے
اس نئی آگ کا اقوامِ کہن ایندھن ہے ملت ختم رسلؐ شعلہ بہ پیراہن ہے
آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

اور آج ــــــــ ساری ماڈرن سوسائٹی اسی بے حیائی، بے سکونی اور مادر پدر آزادی کی وجہ سے اخلاق سے عاری ہو کر حیوانی سطح پر زندگی گزار رہی ہے اور قوم لوط (علیہ السلام) کے سے انجام کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اعاذنا اللّٰہ من ذالك۔

سائنسی ترقی اور صنعتی ترقی کے نتیجے میں خوشحالی آئی تو اس آسودگی اور پرسہولت زندگی کی آسائشوں کو دوام بخشنے کے لئے ابتدا بڑے معصوم انداز میں کی گئی اور بہبود آبادی کے نام پر ترقی اور عیش و دوام کا دلکش اور دل فریب نعرہ دے کر غیر صہیونی دنیا کو بے وقوف بنا دیا گیا۔

بہبود آبادی یعنی انسانی زندگی میں امن سکون، جرائم کی بیخ کنی، عزت و آبرو کی حفاظت، اظہار رائے کی آزادی اور مذہب کی آزادی کی ضمانت دینے والی ریاست کا تصوراتی خاکہ زمانہ قبل از تاریخ سے انسان کے ذہن میں ہے اور اس کے لئے بے شمار لوگوں نے سوچا..... منصوبے بنائے اور اقدامات کیے مگر کامیابی سے ہمکنار ہونے والے منصوبے بہت کم تھے اور اس

میں سے بھی اکثر قلیل مدت میں ختم ہو گئے۔

''موسیٰ (علیہ السلام) سے مارکس تک'' نامی کتاب میں اس کے مصنف نے اس کی تفصیل دی ہے۔ تاہم ایک مثالی فلاحی ریاست کی اس سوچ کو اٹھارویں صدی کے وسط میں اٹھا کر ایک نئے نقطہ نظر سے آگے بڑھانے کا عمل صہیونی ذہن نے ہی آگے بڑھایا ہے۔

ایک فلاحی معاشرے کے تصور اور منصوبے کے خدوخال ہر انسان آسانی سے اپنی گرفت میں نہیں لا سکتا۔ پھر اس فلاحی معاشرے کو وقتی طور پر قائم کیا جا سکتا ہے مگر اس کو طویل عرصے تک قائم رکھنے کے لئے کیا اقدامات ضروری ہیں اور کس طرح کی طویل منصوبہ بندی کی ضروت ہے۔ یہ مرحلہ کٹھن محنت اور گہری سوچ اور فکر کا حاصل ہے اور بعض اوقات انسان دشمن اور غیر فطری اقدامات کا متقاضی ہوتا ہے۔ ماضی میں 632ء تک 640ء تک خلافت راشدہ کا دور انسانی فلاح و بہبود کے لحاظ سے ایک مثالی دور تھا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک عورت غرباء اور ضرورتمندوں میں تقسیم کے لئے رقم لیے پھر رہی تھی اور معاشرے میں لینے والا کوئی فرد نہیں تھا۔ وہاں عدل تھا انصاف تھا۔ آزادئ رائے، کفالت عامہ (روٹی، کپڑا، مکان، علاج، تعلیم) حکومت کے ذمہ تھی۔ تاہم معاشرہ تیس سال (ایک نسل انسانی) سے آگے اپنی خالص شکل میں نہ بڑھ سکا۔

مگر ــــــــــ شیطانی اور ابلیسی ذہن نے جب ان معاملات میں دخل اندازی کی ہے اور انسانی فلاحی ریاست کو مصنوعی انداز میں دوام بخشنے کا منصوبہ سوچا گیا تو ــــــــــ بہت سے ایسے اقدامات کرنا پڑھے کہ انسانیت کے شرم سے منہ چھپا لیا۔

☆ لینن نے روس میں اصلاحات کیں تو 30-40 لاکھ انسانوں کو قتل کر دیا گیا کہ ہمارا ملک ان کی موجودگی میں فلاحی ریاست نہیں بن سکتا۔ یہ شیطنت نہیں تو اور کیا ہے کہ انسانی فلاح و بہبود کے نام پر ایک دو نہیں ــــــــــ مجرم نہیں قاتل اور ڈاکو نہیں معصوم چار ملین انسانوں کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ عقل حیران ہے اسے کہا جائے۔

☆ چین میں ماوزے تنگ کا انقلاب آیا اصلاحات ہوئیں تو اس طرح لاکھوں افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تا کہ باقی لوگوں کے لئے فلاحی منصوبے مؤثر ہو سکیں۔

☆ معاشیات کا علم ایک حد تک آگے بڑھا تو ماہرین معاشیات نے انکشاف کیا (مالتھوس1850ء) کہ انسانی آبادی کی شرح افزائش زیادہ ہے اور وسائل کی شرح ترقی کم ہے۔ انسانی آبادی زیادہ تیزی سے بڑھتی ہے۔یعنیGEO METRIC PROGRESSION میں بڑھتی ہے جیسے 1 سے 2^2=4,4 سے 3^2=9 پھر 4^2=16 گنا ہوتی ہے جب کہ اس کے مقابلے میں وسائل اسے 2,2 سے 3,3 سے 4 گنا بڑھتے ہیں۔

معاشیات کے میدان میں حاصل مطالعہ اور ترقی علم کا نتیجہ یہ نکلا کہ.....ترقی کرنی ہے اور پائیدار اور دیرپا سوسائٹی بنانی ہے تو انسانی آبادی کی شرح افزائش کو روکنا ہوگا۔ ورنہ وسائل ضائع ہو جائیں گے اور لوگوں کو سہولتیں فراہم کرنا ممکن نہیں ہوگا۔

یہیں سے خاندانی منصوبہ بندی اور بہبود آبادی کے نام پر 'قتل انسانی' کا گھناونا جرم شروع ہوا ہے جو قبل از تاریخ کے پتھر کے زمانے کے بے رحم اور سنگ دل انسانوں سے زیادہ بے رحمی سے بروئے کار لا کر، غیر ترقی یافتہ اقوام کو مسلسل قتل کر کے ان کے وسائل پر جائز و ناجائز ہر ممکن طریقے سے قبضہ کر کے کچھ ترقی یافتہ ممالک کے 'خاص' لوگوں کو سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں۔

ایک فلاحی ریاست کے قیام کے نام پر انسانی قتل کی آزادی اور لوٹ مار کی فراوانی کی ضرورت کے پیچھے جو فلسفہ ہے وہ ہے تو پیچیدہ تاہم_____ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں ممکن ہے کہ اخاذ اور بیدار ذہن اس کو اپنی سوچ کا حصہ بنا سکیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان بنائے ہیں اور انسانی تمدن کی گاڑی عورت اور مرد کے ذریعے قائم اور رواں دواں ہے خاندان اور معاشرہ اسی سے بنتے ہیں۔ اگر کسی علاقے کا ایک سردار یہ کوشش کرے کہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہی سہی ایک مثالی معاشرہ قائم کرنا ہے جو فلاح و بہبود کے پیمانوں پر پورا اتر سکے یعنی ہر فیملی کو ایک اچھا گھر میسر ہو_____ بجلی، پانی، نکاسی آب کی سہولتیں میسر ہوں، گھر میں آسائش کی ساری سہولتیں ہوں، سڑکیں ہوں، آمد و رفت کے لئے ذاتی سواری اور پبلک ٹرانسپورٹ کا نظام قائم ہو۔ عدل و انصاف ہو_____ سکول تعلیمی ادارے کالج یونیورسٹیاں ہوں ہر شخص کے لئے معقول روزگار ہو امن و امان_____ جرائم نہ ہوں محرومی نہ ہو۔

اس طرح کی فلاحی بستی کسی محدود علاقے میں منصوبہ بندی کر کے بنائی جاسکتی ہے اور مغرب نے اس طرح کی کئی بستیاں بسا دیں_____ مگر انسانی مزاج اور فطرت کے اپنے اصول ہیں۔عملاً یہ ہوتا ہے کہ 1000 خاندانوں کے لئے آپ نے ایک 'الجنّت ٹاؤن' بنا دیا ساری سہولتیں فراہم کر دیں مگر 10 سال بعد معلوم ہوا کہ ایک فیملی میں پہلے صرف میاں بیوی تھے اب پانچ بچے ہیں۔دوسری فیملی پہلے ایک بچہ تھا اب ماشاءاللہ چھ بچے ہیں۔کسی میں دو ہیں کسی میں چار کا اضافہ ہو چکا ہے۔ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی گھر میں کوئی اولاد نرینہ نہ ہو۔تاہم یہ شاذ ہے اور مجموعی طور پر صورت حال صحیح ہوتی ہے،ابتدا میں قائم کیے گئے سکول ناکافی ہو جاتے ہیں۔تعلیمی ادارے کم پڑ جاتے ہیں، 20 سال میں بچے جوان ہوتے ہیں،علیحدہ گھر چاہئیں، روزگار کے مواقع چاہئیں،بجلی پانی نکاسی آب کا نظام،سڑکیں سب منصوبہ بندی ناکام ہو جاتی ہے۔

لہٰذا_____اہل مغرب نے انسانی فلاح کے نام پر نتیجہ نکالا کہ ہر گھر (فی فیملی)صرف دو بچے ہونے چاہئیں یعنی 1000 خاندانوں کے لئے بسائی ہوئی بستی میں 2000 بچے ہوں گے 30 سال بالعموم بیٹا جوان ہوگا بیٹی جوان ہوگی بیٹا بیاہا جائے گا بہو آجائے گی۔بیٹی شادی کے بعد کسی اور کی بہو بن جائے گی کچھ عرصے والدین_____بیٹا بہو(وہی چار افراد) گھر میں ہوں گے والدین بوڑھے ہو کر فوت ہو جائیں گے اس خاندان میں بھی 2 بچے ہوں گے اور اس طرح اگلے 30 سالوں میں پھر وہی عمل دہرایا جائے گا۔ یوں_____جو سہولتیں ریاست نے ایک دفعہ مہیا کر دی ہیں سکول، ادارے، کالج ،مارکٹیں،سڑکیں،سہولتوں کا نظام،ٹرانسپورٹ کا نظام بنا دیا ہے وہ بہت تھوڑے تغیر و تبدل کے ساتھ جاری و ساری رہے گا۔

کاغذی طور پر تو یہ منصوبہ بڑا دلکش اور جاذب نظر ہے مگر عملاً انسان کو ان اصولوں کے شکنجے میں کس دینا کہ بس یہ ہوگا اور یہ نہیں ہوگا_____عمومی انسانی نفسیات کے خلاف ہے۔اس موقع پر صہیونی مافیا نے یہاں ہار نہیں مانی۔یہ کام چونکہ اس کے خود تراشیدہ عالمی اسرائیلی ریاست کے قیام کے منصوبہ کا ابتدائیہ ہے جس کے لئے دوسری اقوام کو کنٹرول کرنا اس میں شامل

ہے لہٰذا ــــــــــ بہبود آبادی کے حسین نعرے کے نام پر اقوام عالم کو دھوکا دیا گیا اور آبادی کو کنٹرول کرنے کے عالمی سطح پر منصوبے بنائے گئے اور اس کے لئے وافر وسائل مہیا کیے گئے اور ہر قوم کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ ان کی فلاح اسی میں ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی کے ذریعے ہر فیملی کا سائز دو بچوں تک محدود کر دیا جائے کہ دو بچے یا اس سے بھی کم بچے ترقی یافتہ ہونے کی دلیل ہے سمجھی جائے اور زیادہ بچے ہونا جاہلیت، جامد مذہبیت کی علامت اور پس ماندگی نشانی سمجھا جائے جس سے معاشرہ ترقی نہیں کر سکے گا بچے تعلیم سے محروم رہ جائیں گے، روزگار میسر نہیں آئے گا وغیرہ وغیرہ۔

صرف یہاں تک کوششیں ہوتیں اور بس ــــــــــ تو شاید نسل انسانی کا اتنا زیادہ نقصان نہ ہوتا جب نتائج خاطر خواہ نہیں نکلے اور انسانی نفسیات، مزاج اور خواہشات کو لگام نہیں دی جا سکی تو اس ظالم اور انسان دشمن ابلیسی ذہن نے انسان کو فیملی لائف سے باہر اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے تفریح سیر، ٹورازم ہوٹلنگ کے نام پر بے حیائی اور غیر اخلاقی سرگرمیوں کو فروغ دیا ہے اور اس کے لئے بے پناہ وسائل خرچ کیے ہیں۔ اس کے لئے کوشش کر کے بے پناہ مواقع اور ایجادات فراہم کی گئیں۔

1882ء میں نیویارک میں بجلی آئی۔ 1892ء میں سینما ایجاد ہوا، چند سال بعد تصویر کے ساتھ آواز والی فلمیں آ گئیں، ساری دنیا میں سینما انڈسٹری کو عام کر دیا گیا، پھر ریڈیو آ گیا، پھر بے حیائی اور بے لباسی کے لئے سیر و تفریح، اجتماعی انداز میں نہانے کے لئے سوئمنگ پول، ساحل سمندر کی سیر گاہیں اور ہوٹلنگ کو فروغ دیا گیا۔ امریکہ ہی میں ٹی وی آ گیا۔ پہلے یہ صرف بلیک اینڈ وائٹ تھا، پھر 1933ء میں رنگین ٹی وی آ گیا، پھر ویڈیو فلمیں ــــــــــ VCR آ گیا، پھر کمپوٹر ــــــــــ سی ڈی اور پھر انٹرنیٹ آ گیا جس سے دنیا بھر میں بے حیائی کا سیلاب آ گیا۔

فلاحی ریاست کے دوام کی ایک معصوم سی خواہش سے آغاز کر کے ابلیسی ذہن نے انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا اشرف المخلوقات انسان سے گرا کر جانور بلکہ درندہ بنا دیا۔

انسانی آبادی کنٹرول ہو گئی، فلاحی ریاست بھی بن گئی۔ مگر اس فلاحی ریاست کے رہنے

والے انسان ''حیوان'' بن گئے۔اخلاق و کردار سے عاری بلکہ لباس و تہذیب سے بھی عاری ــــــــــ جانوروں کی سطح پر زندگی گزارنے والے انسانیت کے اس 150 سالہ طویل سفر میں انسان نے کیا کھویا کیا پایا؟ یہ اعداد و شمار بے حد حیران کن ہیں۔

ترقی یافتہ ممالک بمقابلہ غیر ترقی یافتہ ممالک

دنیا کے ترقی یافتہ ممالک G-15 میں ان ریاستوں کو فلاحی ریاستیں شمار کیا جاتا ہے اپنے کے اخراجات پورے کرنے کے لئے یہ ممالک ساری دنیا (غیر ترقی یافتہ اقوام) کو لوٹ کر اپنے ملک کا بجٹ بناتے ہیں۔گویا ان ممالک کے باشندوں کی فلاحی و بہبود باقی اقوام عالم کی تباہی کے عوض قائم ہے۔ یہ مغربی اداروں ہی کی رپورٹیں ہیں کہان ترقی یافتہ ممالک میں دنیا کے صرف 20% انسان بستے ہیں جب کہ ان ممالک کے پاس دنیا کا 76% سرمایہ ہے باقی 80% انسانوں کے لئے صرف 24% وسائل ہیں اور ان 24% وسائل میں سے بھی ہر ملک کے اپنے جاگیردار، سرمایہ دار، تاجر، کرپٹ حکمران، فوجی و سول بیوروکریسی کے بعض بدکردار افراد بھی شامل ہیں؛ لہٰذا ان ممالک کے افراد کی اکثریت کے پاس دو ڈالر روزانہ کی بھی اوسط آمدنی نہیں ہے۔ (لعنت ہے ایسی فلاحی ریاستوں پر جو دوسرے اپنے جیسے انسانوں کو لوٹ کر اور بھوکا رکھ کر چلائی جا رہی ہوں)

شرح پیدائش کے لحاظ سے اقوام مغرب کی کیفیت

بہبود آبادی کے نام پر آبادی کی منصوبہ بندی اور مختصر فیملی کے سلسلے کی اقدامات کرنے کا وہ سفر جو بڑا دلفریب بھی تھا اور بڑا حسین بھی ــــــــــ اب انسانیت کا قافلہ ڈیڑھ صدی بعد کہاں پہنچا ہے وہ بڑا خوفناک منظر ہے۔ یورپ امریکا کے اہل علم اور دانشور آئندہ دو تین دہائیوں میں آنے والے دور کے تصور سے ہی لرزہ براندام ہیں اور انہیں اپنی نسل کی تباہی اور تہذیب کے فنا ہو جانے کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا۔

انسانی خواہشات کو بے راہ روی کی طرف موڑ کر فیملی لائف سے باہر سکون کی تلاش کا سفر ایسا خوفناک 'جوا' تھا جو مغرب کے دانشوروں نے کھیلا کہ اب وہ وبال جان بن گیا ہے۔ بہت

زیادہ علم، تجربہ، وسائل اور سائنٹفک انداز کے باوجود مغرب کے یہ دانشور فطرت انسانی سے مات کھا گئے۔

نفسیات انسانی کے لحاظ سے ان دانشوروں نے یہ سمجھا تھا کہ مشینوں کو کنٹرول کرنا اور سوئچ آن/ آف کر کے کسی کام کو روک دینا یا دوبارہ شروع کر دینا ایسا اصول ہے جو نفسیات انسانی اور محرکات عمل کے ضمن میں بھی چل جائے گا مگر یہ مفروضہ اتنی بڑی حماقت (BLUNDER) ثابت ہوا ہے کہ اب واپسی (REVERSAL) کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ فلاحی ریاست کے قیام کے لئے آبادی کو کنٹرول کرنے کے لئے شرح پیدائش میں کمی کے ضمن میں شرح پیدائش کو 2.0 تک کم کرنا ان منصوبہ سازوں کا مطمع نظر تھا کچھ دیگر عوامل کے پیش نظر اس شرح کو 2.2 رکھا گیا۔ مگر ڈیڑھ صدی بعد نتیجہ ——— آج کی رپورٹوں کے ذریعے ہمارے سامنے ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں:

2008ء کی مردم شماری اور آبادی کی رپورٹوں کے مطابق یورپی ممالک اور امریکا کی صورت حال کچھ اس طرح ہے کہ یہ شرح پیدائش 2.2 سے کہیں نیچے جا چکی ہے کوئی مرد اور عورت گھر گھرستی، بچوں کی پیدائش کا وبال اور بوجھ اٹھانے کو تیار نہیں بڑی کوششوں کے باوجود یہ شرح پیدائش اب 1.3 کے لگ بھگ ہے۔ ماہرین کے نزدیک اگر کسی ملک اور تہذیب میں شرح پیدائش 2.2 تک رہے تو وہ ملک اور تہذیب زندہ رہے گی جبکہ اس سے کمی کا رجحان آ جائے تو وہ ملک اور تہذیب آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گی۔ اگر 2.2 سے ذرا کم ہو تو اس شرح کو مختلف لالچ (INCENTIVES) کے ذریعے دوبارہ واپس لایا جا سکتا ہے۔ جبکہ..... یہ شرح پیدائش اگر 1.3 کے قریب آ جائے تو اس کو واپس نہیں لایا جا سکتا۔ بالفاظ دیگر اس تجزیہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر مختلف تفریحی اقدامات اور فیملی سے باہر تفریح اور سکون کے لئے کئے گئے اقدامات کے لحاظ سے کسی معاشرے کا رجحان ابتدائی درجے میں ہے تو اس کو واپس لایا (REVERSE) جا سکتا ہے جبکہ مصنوعی سکون کے یہ طور طریقے کسی معاشرے میں رواج پکڑ جائیں اور شرح پیدائش 1.3 تک آ جائے تو اس معاشرے کے اطوار نہیں بدلے جا سکتے اور یہ معاشرہ ایک نسل کے اندر ہی تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گا۔

اوپر درج مثال کے اعتبار سے ہی دیکھیں کہ اگر شرح پیدائش 1.8 کے لگ بھگ ہے اور گراف ابھی اور نیچے جا رہا ہو تو ـــــــ عملاً کیا ہوگا کہ 1000 ـــــــ خاندانوں میں صرف 1800 بچے پیدا ہوں گے پھر والدین کی وفات اور شادی کے بعد صرف 900 خاندان رہ جائیں گے اور بچپن کی وفات اور دیگر بیماریوں کا عنصر شامل کر لیں تو اگلی نسل میں ایسا معاشرہ خود بخود فنا ہو کر رہ جائے گا اور ایسے معاشرے کی اصلاح بھی نہیں ہو سکتی۔

اس وقت یورپی ممالک کی شرح پیدائش کے لحاظ سے صورت حال یہ ہے:

عیسائی لوگوں میں	ملک	شرح پیدائش
	فرانس	1.8
	برطانیہ	1.6
	یونان	1.3
	جرمنی	1.3
	اٹلی	1.2
	سپین	1.1

پورے متحدہ یورپ کے 31 ممالک مجموعی شرح پیدائش 1.38 ہے۔

کسی خاندان یا قوم یا نسل میں شرح پیدائش کا گرتے گرتے 1.8 سے نیچے آجانا ماہرین آبادیات کے نزدیک ایسی خوفناک علامت (SYMPTOM) ہے کہ جس پر فوری توجہ دے کر شرح پیدائش کی کمی کا باعث بننے والے عوامل کو ختم نہ کیا جائے تو اگلی نسلوں میں یہ شرح کم ہو کر نا قابل اصلاح حد تک گر جائے گی جس کے نتیجے میں اس قوم کا فنا ہو جانا ہی مقدر ہوگا۔

کسی نسل یا قوم یا تہذیب میں جو عوامل شرح پیدائش میں کمی کا باعث بنتے ہیں وہ مادی ترقی کے باعث تعیّشات میں پڑ جانا ہے اور کسی قوم کے افراد کا بالعموم اور مرد و عورت کا مشقت اٹھانے والا مزاج (بچوں کی پیدائش اور پرورش کی ذمہ داریاں) چھوڑ دینا ہے۔ مرد میں یہ احساس کہ میں خود کیوں اتنی محنت کروں اور کما کر اولاد کو کھلاؤں لہٰذا بچے زیادہ نہ ہوں ـــــــ اور یہ بات میڈیا کے ذریعے عام ہو جائے کہ ـــــــ کم بچے خوشحال

گھرانہ ر بچے دو ہی اچھے ـــــــــــــــ تو کون خوشحالی نہیں چاہتا؟ ایک آدھ نسل میں مرد کے ساتھ عورت بھی اس سوچ کی حامل ہو جاتی ہے۔ بچوں کی پیدائش اور پرورش کا زیادہ بوجھ عملاً عورت کو برداشت کرنا پڑتا ہے اور اگر عورت بھی اس تکلیف کو اٹھانے سے گریزاں ہو جائے تو معاشرے میں کم بچوں کا رجحان تیزی سے پھیل جائے گا، بدکاری عام ہو جائے گی، مانع حمل اشیاء اور ذرائع وافر میسر ہوں گے اور عام ہو جائیں گے؛ اسی کا منطقی نتیجہ اسقاطِ حمل کو عورت کی صحت اور عمومی آزادی کا شاخسانہ قرار دے کر نہ صرف جائز بلکہ ضروری خیال کیا جانے لگے گا۔ ترقی (پیسہ، عزت، شہرت، عیاشی سہولتوں) کا مطلب ذاتی اور خودغرضانہ انداز میں لذتوں کا حصول رہ جائے گا اور قومی و اجتماعی سطح پر تمدنی مصالح نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گے۔

اوپر درج سارے عنوانات وہ ہیں جو مغرب نے گزشتہ دوسو سال سے آزادیٔ نسواں کے نام سے ایک تحریک چلا کر عام کئے ہیں ترقی پذیر ممالک میں تو علم کی کمی، زندگی کی سہولتوں کا فقدان اور دیگر عوامل کی بنا پر یہ سکیم پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکی مگر ترقی یافتہ ممالک ـــــــــــــــ ترقی کے زعم میں شرح پیدائش کی شدید کمی کے عذاب میں مبتلا ہو چکے ہیں اور اب یہ شرح امریکہ کنیڈا میں تیزی سے گر رہی ہے اور یورپ کے تمام 31 ممالک میں مجموعی شرح 1.38 ہے جس کو کسی ترغیب اور معاشرتی دباؤ کے ذریعے واپس لانا ممکن نہیں ہے۔ کسی قوم کے افراد مرد و زن اس طرح کی آزادی کے رسیا ہو جائیں اور دو تین نسلیں اسی طرح گزر جائیں تو ان کو دوبارہ مشقتوں کا عادی بنانا ناممکن ہے۔ مکمل تباہی اس کا واحد علاج ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یورپ میں شرح پیدائش اس حد تک کم ہے مگر یورپ کی آبادی تو بڑھ رہی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب ذرا تفصیل میں جائیں تو بڑا سادہ ہے۔ یہ مغربی ممالک اپنی ترقی کا ڈھنڈورا پیٹتے میں غیر ترقی یافتہ ممالک بالخصوص ترکی، مشرقی وسطی وغیرہ سے لوگوں کی آمد اور مستقل آبادی کے لئے دروازے کھولے رکھتے ہیں IMMIGRANTS کی وجہ سے ہی مجموعی آبادی میں کمی نہیں آ رہی۔ صنعتی ترقی کے لئے لیبر اور افرادی قوت کی ضرورت ناگزیر ہے۔ MODRENISATION اور AUTOMATION کے نام بہت سے کام اب

کمپوٹرائز ڈانداز میں چلتے ہیں تاہم افرادی قوت کی ضرورت کسی طور پر ختم نہیں کی جاسکتی۔

امریکہ کینڈا اور بالخصوص یورپ میں گزشتہ ایک صدی میں باہر سے آکر آباد ہونے والے لوگوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ان مسلمان آبادکاروں میں کئی وجوہات سے شرح پیدائش بہت زیادہ ہے جس کی وجہ سے ان ممالک میں مسلمانوں کی آبادی مسلسل بڑھ رہی ہے۔

کئی مسلمان ملکوں میں شرح پیدائش 3.8 سے زیادہ ہے اور مسلمانوں کا یہی مزاج یورپ امریکہ میں IMPORT ہوجاتا ہے جس سے ان ممالک میں مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ کی رفتار بہت زیادہ ہے اور اس مسلم بمقابلہ غیر مسلم اضافۂ آبادی کو دیکھیں تو عیسائیوں کی گھٹتی ہوئی شرح پیدائش کے مقابلے میں یہ اعداد وشمار خطرناک نظر آتے ہیں۔

مسلم آبادی بم

نیوکلیر پاور اور ایٹمی ہتھیاروں کا خوف تو دنیا پر طاری ہے ہی.....اور مغربی طاقتوں نے کمزور ممالک بالخصوص مسلمان ممالک (عراق، افغانستان، پاکستان) میں دہشت گردی اور غنڈہ گردی پھیلا رکھی ہے تاہم خود مغربی ممالک کے دل میں مسلم آبادی کے مسلسل اضافے نے ایک ٹائم بم کی حیثیت اختیار کرلی ہے اور یہ خوف انہیں کسی کروٹ چین نہیں لینے دے رہا؟

☆ فرانس میں مسلمانوں کی تعداد میں 3.8 شرح پیدائش سے اضافہ ہورہا ہے اور مسیحی نسل میں شرح پیدائش کم ہوکر 1.3 پر آگئی تو اگلے چالیس سالوں میں فرانس مسلم اکثریت کا ملک ہو جائے گا۔

☆ جرمنی اگلے 20 سالوں میں مسلم اکثریت کا ملک ہوگا۔

☆ برطانیہ میں پچھلے 30 سالوں میں مسلم آبادی میں 30 گنا اضافہ ہوا ہے اور اگلے 25 سالوں میں (2035ء میں) یہ ملک بھی مسلم اکثریت کا ملک ہوگا۔

☆ اٹلی، سپین وغیرہ کی شرح پیدائش اتنی گر چکی ہے کہ اب ناقابل اصلاح ہے اور بہت جلد مسلم اکثریت کے علاقے ہوں گے۔

☆ ترکی کو یورپی یونین میں نمائندگی نہیں دی جاتی اس کی وجہ اس ترکی ملک کا مسلم ہونا ہے اگر یہ اجازت مل جائے اور ترک مسلمان یورپی یونین کے ممالک میں آزادانہ رہائش رکھ سکیں تو

مسلمانوں میں شرح پیدائش کے اعداد وشمار کے پیش نظر ———— یہ سارا علاقہ بھی بہت جلد مسلم اکثریت کا علاقہ ہوگا۔

شرح پیدائش یا بچوں ——— کی جنگ

لیبیا کے صدر معمر قذافی نے 20 سال قبل کیا تھا کہ پورا یورپ اگلے 50 سال میں مسلم ریاست بن جائے گا ———— نہ فوج کی ضرورت ہے نہ اسلحہ کی نہ گولی چلے گی نہ خون خرابہ ہو گا نہ کوئی تباہی آئے گی مگر نتیجہ حاصل ہو جائے گا۔ جناب معمر قذافی صاحب کا یہ اندازہ اب اہل مغرب کو بچشم سر نظر آ رہا ہے اور وہ اس کا واویلا مچا رہے ہیں۔

مغرب نے گزشتہ کئی دہائیوں میں دیگر شعبہ جات کی طرح آبادی اور شرح پیدائش میں کمی کے لئے مسلسل اور منظّم مہم چلائی ہے جس کے نتیجے میں دنیا میں گھر سے باہر عیاشی، ٹورازم، بے حیائی، مانع حمل ادویات کی کثرت اور اسقاطِ حمل جیسے معاملات کی حوصلہ افزائی، آزادیِ نسواں اور موسیقی کے ساتھ راگ رنگ کی حامل اس مہم کے نتائج اب سامنے آ رہے ہیں اس صورت حال کا اب اہل مغرب کو خوب اندازہ ہو رہا ہے۔ علامہ اقبال نے ایک صدی قبل کہا تھا:

یہ تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
شاخِ نازک پہ جو آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

مگر ———— مسلم ترقی پذیر ممالک میں ان کی خاندانی 'منصوبہ بندی' بہبود آبادی اور پولیو کے ٹیکوں میں شامل اجزاء کے ذریعے مسلم آبادی کو کم کرنے کے منصوبے بڑے زور وشور سے جاری ہیں۔ یہ بات ہمارے ملک کے منصوبہ سازوں اور مقتدر طبقات کے سوچنے اور اس کی روشنی میں لائحۂ عمل بنانے کی متقاضی ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ پانی سر سے گزر جائے اور ہمیں اس وقت کچھ کرنے کی ضرورت کا احساس ہو۔

قرآن مجید میں سورۃ الطّلاق میں ایسی اقوام کا ذکر ہے جو انسانی تمدن اور فیملی لائف میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں نکاح، طلاق، عدت، پاکیزگی، حیض ونفاس جیسے معاملات میں اللہ کی حدود کا لحاظ نہیں رکھتے پھر حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی طرح بے راہ روی کا

شکار ہو کر بہت دور نکل جاتے ہیں۔ جیسے آج کا مغرب۔ تو ان قوموں کے لئے منفرد قسم کا عذاب ہوتا ہے۔

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَ رُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا وَّ عَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًاO

''اور بہت سی بستیوں (کے رہنے والوں) نے اپنے پروردگار اور اس کے پیغمبروں کے احکام سے سرکشی کی تو ہم نے ان کو سخت حساب میں پکڑ لیا اور ان پر (ایسا) عذاب نازل کیا جو نہ دیکھا تھا نہ سنا''

اس آیت میں 'امر' سے مراد انسانی سرشت کی وہ جبلی حدود و قیود ہیں جو تمام حیوانوں میں بھی اپنی 'نوع' کے لحاظ سے ودیعت شدہ ہیں۔ ان بدیہی اور فطری ــــــــــ داعیات کی حدود کو فراموش کر دینا عذاب الٰہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے اور یہ عذاب بمباری یا کسی جنگ کے نتیجے میں نہیں مسلط ہوگا بلکہ ــــــــــ یہ عذاب 'خواتین' کے معاملات کو حد اعتدال سے نکال کر مصنوعی اور خود ساختہ آزادی کی وجہ سے بے لگام کر دینے کی شکل میں ہوگا۔ [یاد رہے کہ آج کی اس ترقی یافتہ دنیا میں ظلم ہی ظلم ہے بے روزگاری ہے، اوقات کار کی زیادتی ہے اجرت میں کمی ہے، سہولتوں کا فقدان ہے، علاج معالجہ میسر نہیں، تعلیم نہیں ہے۔ یہ ظلم مردوں پر بھی ہے اور عورتوں پر بھی ہے تاہم عورتوں پر کچھ ظلم مردوں کی طرف سے مزید ہو رہا ہے۔ گھریلو اخراجات نہ دینا، مار پیٹ، چھوٹی عمر کی شادیاں 'ستی' اور 'ونی' جیسی رسمیں، وراثت کا حق نہ دینا، بڑھاپے میں نگہداشت کا نہ ہونا وغیرہ ایسے مظالم ہیں جو ہر معاشرے میں ہیں اور مسلم معاشروں میں بھی دین کی دوری کی وجہ سے آ گئے ہیں حالانکہ اسلام اس طرح کے ظلم کی کسی صورت اجازت نہیں دیتا بلکہ اسلام نے تو خواتین کو وہ حقوق دیے اور علی الاعلان دیے جو اہل مغرب بمشکل چند عشرے قبل دے پائے ہیں اسلام نے مرد و زن کی مساوات کی ہے اور عزت و وقار، اعمال، آزادی، جائیداد، کاروبار وغیرہ کی (اسلامی احکام کے اندر رہتے ہوئے) اجازت دی ہے اور ذی وقار اور ذی عزت فرد نوع بشر بتایا ہے۔ جبکہ دوسرے معاشروں میں اس کا عشر عشیر بھی عورت کو میسر نہیں ہے۔] یعنی.....آبادی میں شرح پیدائش کے حد درجہ کم ہو جانے کی وجہ سے مرد و عورت کا فطری بوجھ

اُٹھانے سے 'گریز' جس کا آج امریکہ، یورپ شکار ہے' یہ ہے تہذیبی خودکشی اور 'نسل کے فنا' ہونے کا عذاب۔ سراسر خسارہ اور نیست و نابود ہو جانے کا اندیشہ

وَ کَانَ عَاقِبَۃُ اَمۡرِھَا خُسۡرًا O

اور ان کا انجام نقصان ہی تو تھا

خسارہ کہتے ہی ایسے صورت کو ہیں کہ کوئی نعمت یا سہولت آپ کو پہلے میسر ہے اور تھوڑے وقت یا وقفے کے بعد وہ نعمت یا سہولت چھن جائے۔ مال ہے اور چھن گیا یہ کاروباری خسارہ ہے، صحت کی بربادی بھی ایک طرح کا خسارہ ہے، عام حالات میں جان کا چلے جانا بھی خسارہ ہے، رشتہ داروں عزیزوں کا فوت ہو جانا بھی خسارہ ہے (اس خسارہ سے بچاؤ یعنی مال و دولت، صحت، جان، اعزہ و اقارب سب کچھ مسلسل یا عارضی طور پر چھن کر دوبارہ مل جانے کا طریقہ، ایمان عمل صالح ——— تواصی بالحق ——— تواصی بالصبر ہے اور کچھ لوگ جو بے دین ہیں اور اللہ کی نافرمانی کی زندگی گزار رہے ہیں اور ظلم و زیادتی کے ساتھ مخلوق خدا کو نقصان پہنچا رہے ہیں فساد فی الارض کر رہے ہیں وہ ابدی خسارہ سے دوچار ہوں گے اور دنیا میں بھی یہ چیزیں چھن جائیں گی اور آخرت میں بھی ایمان کے نہ ہونے کی وجہ سے دوبارہ نہیں ملیں گی۔

خَسِرَ الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃَ ذٰلِکَ ھُوَ الۡخُسۡرَانُ الۡمُبِیۡنُ (الحج۔11)

''اس نے دنیا میں بھی نقصان اٹھایا اور آخرت میں بھی، یہی تو نقصان صریح ہے''

اس طرح کا خسارہ اور نسلوں، قوموں اور تہذیبوں کا معدوم ہونا بہت بڑا نقصان اور خسارہ ان لوگوں کا مقدر ہے جو فیملی لائف میں 'حدود اللہ' کی پرواہ نہیں کرتے اور اجتماعی اور انفرادی سطح پر انسانی زندگی کی بنیادوں کو ڈھانے کی کوشش کرتے ہیں جس سے انسانی سوچ میں کجی آجاتی ہے، نسل انسانی کی افزائش کا معاملہ متاثر ہو جاتا ہے۔ اور ایسے معاشرے اور تہذیبیں خود ساختہ ترقی کے پیمانوں کے تحت ترقی یافتہ ہو کر بھی ——— درحقیقت ذہنی اور فکری شوریدگی کے باعث صفحۂ ہستی سے مٹ جاتے ہیں۔ اوپر درج کردہ آیت میں 'خُسۡرًا' کی یہی تعبیر ہے۔

اب ——— سب سے آخر میں خود پاکستان کا معاملہ ہے۔ مغرب بظاہر دوستی،

امداد، قرض، مشاورت، نصیحت، ٹیکنالوجی، ٹرانسفر اور تعلیمی اداروں کی آڑ میں اپنی تہذیب کو برتر ثابت کر کے ہمیں اپنی روایات سے دور کرنے کے لئے جاہلانہ رسم ورواج، روایت پرستی، مذہبیت کا طعنہ دے کر اور بے حیائی، بدکرداری، شراب وغیرہ کے فروغ کو ترقی کا نام دے کر ہماری آبادی کے فطری تناسب اور شرح پیدائش کو ایسی سطح پر لانے کے لئے نصف صدی سے سرتوڑ کوشش کر رہا ہے۔ حقیقت کیا ہے ——— مگر ان کے اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ ہماری شرح پیدائش بھی 3.5 سے اب 2.2 ہو چکی ہے اور رو بہ زوال ہے۔

ان کی حالیہ رپورٹ کے مطابق پاکستان کا پاپولیشن گروتھ ریٹ 2.2 رہ گیا، 65 سال سے زیادہ افراد کی تعداد تین فیصد ہے۔

لاہور (لیڈی رپورٹر) پاکستان کی آبادی ایک رپورٹ کے مطابق 22 کروڑ ہو چکی ہے اور پاپولیشن گروتھ ریٹ 3.5 سے کم ہو کر 2.2 رہ گیا ہے۔ 65 سال سے زیادہ عمر کے افراد کی تعداد تین فیصد رہ گئی ہے پیدائش سے 14 سال تک کے بچے 42 فیصد ہیں خواتین کی تعداد 1.05 مردوں کے مقابلے میں کم ہے جبکہ 2015ء تک 0.93 مرد بچیں گے 1997ء میں ورک فورس میں عورتوں کی تعداد 27 فیصد تھی جبکہ 2010ء میں 37 فیصد عورتیں ورک فورس کا حصہ ہیں۔ 1951ء میں لڑکیوں کی شادی اوسط عمر 17 سال تھی جو 2005ء میں 22 سال ہو گئی ہے 2009ء میں 24 سال رہی۔ 1980ء میں پاکستان میں ایک عورت 6 بچے اوسطاً پیدا کرتی تھی جبکہ 2006ء میں 4، 2007ء میں 3.7 اور 2008ء میں 3.5 تک رہی 2010ء میں ایک عورت تین بچے اوسطاً پیدا کرے گی۔ پاکستان میں شرح پیدائش میں کمی بہت تیزی کے ساتھ ہوئی ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق اسلامی ملک ہونے کے باوجود ساؤتھ ایشین ریجن میں صرف ماؤں کے دودھ پر پلنے والے بچوں کی شرح 31 فیصد ہے جو بہت کم ہے۔ (ماخوذ از ماہنامہ عرفات لاہور۔ مارچ 2010)

اگر اس رپورٹ کا دسواں حصہ بھی صحیح ہے تو ہمیں اپنے مستقبل کی فکر کرنی ہوگی.....ورنہ بقول شاعر

ع تمہاری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اس خوفناک صورتحال سے نکلنے کے لئے ہمیں درج ذیل اقدامات کی ضرورت ہے:

1۔ نوزائیدہ بچوں کو ماں کا دودھ پلانا از حد ضروری ہے اس سے بچوں کی پیدائش میں عام طور پر وقفہ خود بخود تین، چار سال کا ہو جاتا ہے اور بچے اور ماں کی صحت اچھی رہتی ہے۔

2۔ اپریشن (CEASARIAN BIRTH) کے ذریعے بچوں کی پیدائش کی حوصلہ شکنی ضروری ہے کہ اس سے تیسرے بچے کی پیدائش کا مرحلہ ہی نہیں آتا ہے اور بات ہمارے دشمنوں کی ہی پوری ہو جاتی ہے۔

3۔ فیملی لائف اور نکاح کی زندگی گزارنے کی ترغیب وتشویق ــــــــــ یعنی نکاح اور شادی کو کم خرچ اور آسان بنانا۔ اسلام کے مطابق چلیں تو لڑکی والوں کے لئے جہیز بارات، کھانا، دعوت، مہندی، سب رسمیں فضول ہو جاتی ہیں۔

مسجد میں نکاح اور آسان رخصتی جلد شادیوں کی ضمانت ہے اور جلد شادی (صحیح عمر بچیوں کے لئے 18 تا 20 سال اور لڑکوں کے لئے 21 تا 25 سال) صحت مند فیملی لائف اور شرح پیدائش کے 3.0 تا 4.0 کے درمیان رہنے کی ضمانت ہے اور یہ شرح پیدائش تہذیبی اور نسلی طور پر مسلمان امت کے بقا کی ایک علامت ہے۔

ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا!

النکاح مِن سنتی (ابن ماجہ۔ عن عائشة رضی الله عنها)

''نکاح میری سنت ہے''

اور مزید فرمایا:

فمن رغب عن سنتی فلیس منی (متفق علیہ۔ عن انس ﷺ)

''جس نے میری سنت سے روگردانی کی میرا اس سے کوئی تعلق نہیں''

متاہل زندگی اور فیملی لائف ہی آنحضرت ﷺ کی پیروی اور غلامی کا حاصل ہے اور مغرب کے منصوبوں کو خاک میں ملانے کا واحد ذریعہ ہے۔ آج کے دور میں ہم اگر اپنے پیغمبر ﷺ کے راستے پر چلتے ہوئے فیملی سسٹم کو نہ بچا سکے تو مسلمان ہونے کے ہمارے زبانی دعوے کسی کام نہیں آسکیں گے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں زندگی کے ہر شعبے بشمول فیملی لائف میں دین کے احکام کی پاسداری کرنے کی توفیق بخشے اور نکاح طلاق وغیرہ کے احکام کے ضمن میں عورت مرد کے جو حدود وحیِ جلی اور وحیِ خفی نے متعین کر دیے ہیں ان کے اندر اندر رہنے کی توفیق عطا فرما دے۔ آمین

انہیں امور کو قرآن میں حدود اللہ میں شمار کیا گیا ہے۔ اور قارئین حیران ہوں گے کہ قرآن پاک میں کل 13 مرتبہ 'حدود اللہ' آیا اور دوسرے پارے میں جہاں چار رکوعوں میں نکاح و طلاق کے احکام آئے ہیں وہاں چار آیتوں میں چھ مرتبہ 'حدود اللہ' کے الفاظ آئے ہیں جس سے اس موضوع پر اللہ تعالیٰ کے انسان کے اندر ودیعت کردہ فطری اور جبلی صحت مند تقاضوں پر روشنی پڑتی ہے اور اس کی خلاف ورزی پر انسانی نفسیات، مزاج، سوچ، انفرادی و اجتماعی زندگی پر بُرے اثرات کا خاکہ سامنے آیا ہے۔

آج ہم مسلمانوں کو اس لحاظ سے بھی بیدار ہونے کی ضرورت ہے۔ بھارت اور مغرب کی بے حیا، بے غیرت اور عریانی و فحاشی کی تہذیب کو اپنے ہاں سے رخصت کر دینا چاہیے تاکہ آئندہ نسلوں کو اس کے مضمر اثرات سے پاک رکھا جا سکے۔ کیا خوب کہا تھا مولانا ظفر علی خان نے اس تہذیب جدید کے بارے میں جب انہوں نے اس تہذیب کو ناجائز اور حرام قرار دیا تھا:

؎ تہذیب نو کے منہ پر وہ تھپڑ رسید کر
جو اس 'حرام زادی' کا حلیہ بگاڑ دے

خودی اور عقل

ڈاکٹر محمد رفیع الدین (مرحوم)
کی کتاب ''حکمت اقبال'' سے ایک باب

حقیقتِ عقل کا صحیح نظریہ

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اقبال کے فلسفۂ خودی کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ انسان خدا کی محبت کا ایک طاقتور جذبہ ہے جسے سوچنے کے لئے ایک دماغ اور کام کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں دے دیے گئے ہیں۔ چونکہ خدا کی محبت ہی انسانی خودی کے تمام افکار و اعمال کا سرچشمہ ہے' ظاہر ہے کہ عقل انسانی زندگی میں محض ایک ثانوی کردار ہی ادا کر سکتی ہے' اس کے وجود کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ محبت کی خدمت اور اعانت کرے اور وہ اسی مقصد کو پورا کرتی ہے۔ زندگی یا خودی کا اصل سرمایہ خدا کی آرزو ہے، عقل اس آرزو کی پیداوار ہے۔

؎ زندگی سرمایہ دار از آرزو ست
عقل از زائیدگان بطن او ست

خدا کا عشق خودی کا امام ہے اور عقل خودی کی غلام ہے۔

؎ من بندہ آزادم عشق است امامِ من
عشق است امامِ من، عقل است غلامِ من

عقل محض ایک قوت ممیّزہ ہے جو خودی کو اس کے نصب العین کے حصول کے لئے

جدوجہد کرنے میں مدد دیتی ہے۔نصب العین کسی تصور کے حسن کا ایک اندازہ ہوتا ہے جو خودی کو براہ راست اپنے وجدان کی مدد سے کرنا پڑتا ہے۔وجدان درحقیقت آرزوئے حسن کا ہی دوسرا نام ہے جو بالعموم اس وقت برتا جاتا ہے جب آرزوئے حسن کسی چیز کے خوب وزشت،حق و باطل یا نیک و بد کے متعلق فیصلہ صادر کررہی ہواور اپنے لئے علم بہم پہنچانے کا وظیفہ ادا کررہی ہو۔

ہر تصورِ حسن ایک وحدت ہوتا ہے جس کے حسن کو براہِ راست محسوس کیا جا سکتا ہے۔ آرزوئے حسن اپنے فیصلے خود کرتی ہے؛ وہ عقل یا کسی اور قوت کے فیصلے قبول نہیں کرتی اور دراصل انسان کے پاس آرزوئے حسن کے علاوہ کوئی اور قوت ایسی ہے ہی نہیں جو حسن و قبح کے متعلق کوئی فیصلے صادر کر سکے۔البتہ عقل آرزوئے حسن کو اپنے فیصلے کرنے میں مدد دیتی ہے۔احساسِ حسن عقل کے دائرہ اختیار میں نہیں؛اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل حسن کی وحدت کو نہیں دیکھ سکتی؛فقط اس کے اجزا کو دیکھ سکتی ہے اور حسن اجزا میں نہیں ہوتا بلکہ وحدت میں ہوتا ہے۔عقل حسن کی نئی نئی وحدتوں کے اجزا کی طرف آرزوئے حسن کی راہنمائی کرتی ہے۔جس کی وجہ سے اس کی توجہ ان وحدتوں کی طرف ہو جاتی ہے جس کے اندر یہ اجزا موجود ہوتے ہیں۔لہٰذا عقل خودی کی مدد دو طرح سے کرتی ہے ایک تو یہ کہ اسے بتاتی ہے کہ اسے اپنے موجودہ نصب العین کے لئے جدوجہد کس طرح سے کرنی چاہیے۔اور دوسرے یہ کہ اسے نئے نئے بلند تر نصب العینوں یا تصورات حسن کے نظارہ یا مشاہدہ کے لئے اکساتی ہے۔عقل نہ محبت کی قلمرو میں داخل ہو سکتی ہے اور نہ حسن کا مشاہدہ کر سکتی ہے، یہ امتیاز فقط آرزوئے حسن کو ہی حاصل ہے۔چونکہ عقل ہمارے ساتھ کچھ راستہ طے کرتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب ہم حسن کی منزل پر پہنچتے ہیں تو بھول جاتے ہیں کہ مدت ہوئی عقل ہم سے الگ ہو چکی تھی۔

؎ خرد سے راہ رو روشن بصر سے
خرد کیا ہے چراغ رہ گزر ہے
درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغ رہ گزر کو کیا خبر ہے

انسانی اور معاشرتی علوم کی بنیاد محبت ہے نہ کہ عقل

عقل کا یہ نظریہ نفسیات انسانی کے حقائق کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے اور عقل کے دوسرے تمام نظریات کی نسبت زیادہ معقول اور زیادہ یقین افروز ہے۔ اس نظریہ کی رو سے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ انسانی اعمال وافعال کے تمام فلسفے دوسرے لفظوں میں ہمارے تمام انسانی اور معاشرتی علوم مثلاً فلسفہ سیاست، فلسفہ اخلاق، فلسفہ تاریخ، فلسفہ اقتصاد، فلسفہ تعلیم، فلسفہ قانون انفرادی نفسیات، اجتماعی نفسیات وغیرہ عقل سے نہیں بلکہ محبت سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ عقل صرف محبت کی راہنمائی میں ان کو ترتیب دیتی ہے۔ اگر وہ نصب العین جس کی محبت ان کو وجود میں لاتی ہے، صحیح ہوگا تو ان کو ترتیب دینے والی عقل بھی صحیح ہوگی۔ لہٰذا جس انسانی یا معاشرتی علم کا بنیادی تصور خدا نہ ہو وہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام اعمال انسانی کا حقیقی سرچشمہ خدا کی محبت کا جذبہ ہے۔

مقام عقل کے متعلق دور حاضر کی غلط فہمی

افسوس ہے کہ اب تک انسان کے امتیازی اوصاف میں سے اسی ایک وصف کو جسے ادراک یا عقل کہا جاتا ہے حد سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ انسان کا سب سے بڑا وصف جس کی وجہ سے اسے حیوانات پر فضیلت حاصل ہے یہی ہے۔ حالانکہ دراصل انسان کا امتیازی وصف جس کی وجہ سے وہ انسان بنتا ہے اور حیوانات سے برتر ٹھہرتا ہے اس کی آرزوئے حسن ہے جو صرف خدا کے تصور سے مستقل اور مکمل طور پر مطمئن ہوتی ہے۔ کسی نہ کسی درجہ کی عقل تو اعلیٰ سطح کے حیوانات میں بھی موجود ہے۔ لیکن تصورات کے حسن و کمال کی محبت کم از کم حیاتیاتی زندگی سے اوپر کی سطح کے تصورات کی محبت سوائے انسان کے اور کسی حیوان میں موجود نہیں۔ انسان کی عقل کی اگر کوئی اہمیت ہے تو وہ فقط اس قدر ہے کہ وہ انسان کی آرزوئے حسن کی خدمت گزار ہے لہٰذا اس کی اہمیت ذاتی اور اصلی نہیں بلکہ آرزوئے حسن سے ماخوذ اور مستعار ہے۔ اگر انسان کی عقل آرزوئے حسن کی غلام اور خدمت گزار نہ ہو تو وہ اسے حیوانات سے بھی بدتر بنا دیتی ہے۔ حسن کی تمنا میں ہی انسان کی تمام آرزوئیں جنم لیتی ہیں اور اپنی جستجو کی راہیں معین کرتی ہیں۔ حسن کی تمنا ہی انسان کے تمام اعمال کی خالق اور راہبر ہے۔ عقل کو یہ مقام حاصل نہیں۔

حسن خلاق بہار آرزوست   جلوہ اش پروردگار آرزوست

ہر چہ باشد خوب وزیبا وجمیل؛ در بیابان طلب مارا دلیل
نقش او محکم نشیند در دلت آرزو ہا آفریند در دلت

اقبال دور حاضر کے انسان کو جو اپنی نادانی سے عقل ہی کو انسان کا سب سے بڑا امتیازی وصف سمجھا ہوا ہے، خوب جھنجھوڑ کر جذبہ حسن کی اہمیت بتاتا ہے:

ہے ذوقِ تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحب ادراک نہیں ہے
زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعل راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحب ادراک

تجلی کی اہمیت

ہر انسان کے لئے ضروری ہے خدا کی محبت کو تفکر فی الخلق (مشاہدۂ قدرت) تفکّر فی الصفات (عبادت) اور تخلّق باخلاق اللہ (حسنِ عمل) کے ذرائع سے فروغ دے کر درجہ کمال پر پہنچائے۔ اس طریق سے اس کے دل کے اندر خدا کی معرفت کا وہ نور پیدا ہوگا جسے اقبال 'تجلی' یا 'جلوہ' کا نام دیتا ہے اور چونکہ اس طریق سے اس کا جذبہ محبت پوری پوری تشفی حاصل کرلے گا اور اس جذبہ کے علاوہ تشفی کا تقاضا کرنے والا کوئی اور جذبہ انسان کے اندر ہے ہی نہیں لہٰذا اس کے لئے بے اطمینانی اور پریشانی کی کوئی وجہ باقی نہیں رہے گی اور عقل کے لئے ممکن نہیں رہے گا کہ وہ اس کے دل میں کوئی اعتراضات یا شکوک یا شبہات پیدا کرسکے۔ اس کے برعکس اگر انسان کے دل میں خدا کی محبت اس کی استعداد کے مطابق اپنے کمال کو نہ پہنچے گی تو چونکہ اس کے جذبہ محبت کا ایک حصہ غیر مطمئن رہے گا؛ اس کا سکون قلب مکمل نہ ہوسکے گا اور عقل کے لئے موقع باقی رہے گا کہ اس کو شکوک وشبہات میں ڈالتی ہے۔ اگر انسان کا دل خدا کی معرفت کے نور سے پوری طرح منور نہ ہو تو اس کی عقل جو فقط اس نور سے ہی راہنمائی پاسکتی ہے، بھٹکتی رہتی ہے اور اسے مسرور اور مطمئن ہونے نہیں دیتی۔ حکمت کے بیابانوں میں مدتوں خاک چھاننے کے بعد اگر عقل کو کہیں پناہ ملتی ہے تو توحید میں۔

درجہاں کیف و کم گردید عقل

پے بمنزل برداز توحید عقل

اس کے علاوہ چونکہ شریعت کی پابندی اور نیک عملی کی زندگی خدا کی محبت کا نہ رکنے والا تقاضا ہے لہٰذا جب خدا کی محبت اپنے کمال پر ہوگی تو انسان شریعت کی پابندی یا نیک عملی کی زندگی کو کسی مجبوری سے اختیار نہیں کرے گا بلکہ ایک ایسی خواہش سے اختیار کرے گا جسے روکنا اس کے بس کی بات نہ ہوگی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر انسان اپنی عقل کو مطمئن کرنا چاہتا ہے اگر وہ اس کے اعتراضات کا ایسا جواب مہیا کرنا چاہتا ہے جو اس کے لیے مکمل طور پر کافی اور شافی ہو اگر وہ چاہتا ہے کہ دین اور شریعت کے راستوں پر مجبوری سے نہیں بلکہ پورے ذوق وشوق سے گامزن رہے اور نہیں چاہتا کہ مختلف نظریات اور تصورات کے درمیان بھٹکتا پھرے تو اسے اپنے دل کو خدا کی محبت اور معرفت کے نور (تجلی) سے منور کرنا چاہیے ورنہ اس کی روح اس کے فاسد خیالات کی دولتیوں کی مار کھا کھا کر مردہ ہو جائے گی۔ دلوں میں خدا کے نور کا جلوہ فرد اور قوم دونوں کے لئے پیغام حیات ہے اور ہماری فطرت کا ایک زبردست تقاضا یہ ہے کہ ہم اس نور کو اپنے دلوں کے اندر بسائیں۔

؎ بے تجلی مرد دانا رہ نہ برد
از لکد کوب خیال خویش مرد
بے تجلی زندگی رنجوری است
عقل مہجوری و دین مجبوری است

؎ نگہ پیدا کر اے غافل تجلی عین فطرت ہے
کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا

؎ ہے ذوق تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحب ادراک نہیں ہے

؎ بے تجلی نیست آدم را ثبات جلوہ ما فرد و ملت را حیات

تجلی سے یہاں اقبال کی مراد خدا کی معرفت یا خدا کی محبت کا نور ہے۔

خاندان

اجتماعی سوچ کے فروغ کا ذریعہ

زاھدہ تبسم

خاندان کسی بھی معاشرے کی اکائی اور فرد کی اولین درسگاہ ہے۔ یہ چند لوگوں پر مشتمل صرف ایک اجتماع ہی نہیں ہے بلکہ اپنے اراکین کو محبت، شائستگی، فرض شناسی اور وفاداری کے اعلیٰ جذبات سے مزین ماحول فراہم کرنے کا ذمہ دار بھی ہے۔ خاندان کا استحکام معاشرتی بقاء کا بھی ضامن ہے۔ معاشرتی اقدار، ثقافت اور طرز فکر کی سمت بھی متعین کرتا ہے۔ مختلف اقوام میں مذاہب وثقافت کے فرق سے قطع نظر ایک مشترک عنصر جو خاندان کی کامیابی اور مضبوطی کا ضامن ہے وہ ہے خاندان کے اراکین کا آپس میں مضبوط ربط وتعلق اور اجتماعیت۔

مادیت پرستی کے فروغ نے جدید دور کے انسان کو جہاں اور بہت سی صحت مند اقدار سے محروم کیا ہے وہاں ایک عظیم خسارہ خاندانی نظام کا کمزور پڑنا بھی ہے خاص طور پر یورپ اور مغربی ممالک میں جہاں اب اس ناکام تجربے کے بعد واپسی ہو چکی ہے۔ لمحہ فکریہ ہے کہ ہم یورپ کے عمل سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے اپنی روایتی خاندانی اقدار اور قریبی رشتوں کے ثمرات سے محروم ہوتے جا رہے ہیں اور ہمارے فیملی سسٹمز میں خودغرضی، خودپسندی، انفرادی آزادی اور لاتعلقی جیسی خرابیاں آ گئی ہیں۔

پھر بھی مسلم ممالک کی اکثریت میں صورت حال دیگر اقوام سے بہتر ہے اور اس کی واحد وجہ اسلام کا تجویز کردہ نظام ہے جو ہمارے پاس سیرت طیبہ ﷺ کی صورت میں موجود ہے۔

اس نظام کی پیروی کرنے کی صورت میں ایک خاندان مختلف زاویوں (DIMENSIONS) میں معاشرے کے لئے مفید ثابت ہوسکتا ہے مثلاً افراد کی شخصیت و کردار سازی کے لئے، معاشرے کو ایک مضبوط اور مستحکم یونٹ کی فراہمی اور معاشرتی استحکام کے لئے۔

افراد کی شخصیت و کردار سازی

انسان کی ذہنی، روحانی اور حیاتیاتی ساخت اس طرح کی ہے کہ اس کی بقاء اور آرام و سکون مل جل کر رہنے میں پوشیدہ ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک خاندان میں رہنے والے افراد کی شخصیات اور ذہنی رجحانات مختلف ہوتے ہیں۔ معاملات میں اختلافات رائے کی وجہ سے تنازعات بھی جنم لے سکتے ہیں۔ یہاں اسلامی تعلیمات رہنمائی فراہم کرتی ہیں کہ رشتوں کی تقدیس کا خیال رکھا جائے۔ والدین، اولاد، بہن بھائیوں سے درجہ بدرجہ مہربانی، نرمی اور اچھے اخلاق کا مظاہرہ کیا جائے۔

جو گھرانہ ایسے اوصاف کا حامل ہو جاتا ہے وہاں ہر فرد خود اعتماد اور خود آگاہ ہوتا ہے، مضبوط احساس تحفظ رکھتا ہے، بے غرض محبت، بے لوث خدمت اور جذبہ ایثار سے سرشار ہوتا ہے۔

طبی ماہرین کے مطابق ان افراد کے ذہن و روح کے ساتھ جسم پر بھی خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں ایسے لوگ نسبتاً زیادہ عرصے تک صحت مند رہتے ہیں اور لمبی عمر پاتے ہیں۔

گھر کے خوشگوار ماحول کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ ماہرین نفسیات اکثر یہ تجزیہ کرتے ہیں کہ ایسے بچے جن کی پرورش صحت مند، مضبوط ربط و تعلق اور ہم آہنگی والے ماحول میں ہوتی ہے، ان میں زندگی کے چیلنجوں (CHALLENGES) سے نمٹنے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔ موجودہ دور میں لوگ بظاہر سوشل (SOCIAL) تو بہت دکھائی دیتے ہیں اور ان کے مختلف لوگوں سے روابط (CONTACTS) بھی بہت ہیں مگر پرخلوص رشتے ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ جبکہ قرآن پاک میں ہمیں حقوق العباد کے معاملات میں سب سے پہلے والدین اور انتہائی قریبی عزیزوں سے احسن سلوک کی تاکید ملتی ہے؛ کیونکہ والدین اور اولاد کے آپس میں مضبوط تعلقات میں ضرب در ضرب (MULTIPLE) ہونے والی طاقت موجود ہے جو نا صرف یہ کہ ایک خاندان کو ہر قسم کے بحران اور برے حالات سے نمٹنے کے لئے انرجی فراہم کرتی ہے بلکہ بے شمار

خوشیوں میں اضافہ کرتی ہے اور ہر قسم کے تعمیری مواقع فراہم کر دیتی ہے۔

اس تمام صورت حال کے برعکس ایک گھرانہ جو اجتماعیت کے تصور سے محروم ہو، اپنے اراکین پر بھی منفی اثرات مرتب کرتا ہے اور معاشرتی فلاح میں بھی کوئی قابل ذکر کردار ادا کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ طبی ماہرین کے مطابق امراض قلب، ذیابیطس جیسے پیچیدہ امراض کے اسباب میں بڑھتی عمر کے علاوہ انتہائی قریبی رشتوں سے لاتعلقی اور گھر والوں کی توجہ نہ ملنا بھی شامل ہیں۔ گھر کے افراد میں آپس میں ہم آہنگی نہ ہونا یا کسی ایک فرد کو بے حد نظر انداز کیا جانا اور اس کی حق تلفی کرنا اس میں ڈپریشن اور خودترسی کی کیفیات پیدا کر دیتے ہیں۔

خاندانی انتشار افراد میں خودکشی تک کا سبب بن سکتا ہے۔ سماجی علوم کے ماہرین کے مطابق جہاں خاندانی رشتے ناتے (FAMILY TIES) یا سماجی ڈور کمزور پڑ جائیں وہاں خصوصاً نوجوان طبقہ مایوسی اور کم ہمتی کا شکار ہو جاتا ہے اور اسے پہلے گھریلو ردعمل اور پھر معاشرتی ردعمل جیسی پیچیدگیوں کا سامنا ہو سکتا ہے۔ ان کی شخصیت میں خود پسندی اور خودغرضی جیسے منفی عناصر پیدا ہو جاتے ہیں، تخلیقی و تعمیری صلاحتیں کمزور پڑ جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں ماہرین نفسیات کے مطابق بڑھتی عمر کے افراد اگر تنہائی اور عدم توجّہی کا شکار ہو جائیں تو وہ خود کو مختلف بیماریوں میں مبتلا سمجھنے لگتے ہیں اور ان میں وقت سے پہلے بڑھاپے کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں۔

مضبوط اور مستحکم یونٹ کی فراہمی

عمرانی علوم کے مطابق جس خاندان کے افراد اجتماعیت کے اصولوں پر عمل کرتے ہیں وہ کسی بھی معاشرے کو ایک مضبوط اور مستحکم یونٹ فراہم کرتے ہیں یہ وہی اصول ہیں جو ہمارے پاس قرآن اور سیرت طیبہ ﷺ کی شکل میں موجود ہیں۔ اسلامی تعلیمات کا خاص وصف ہے کہ صرف دنیاوی معاملات میں ہی نہیں بلکہ عبادات میں بھی اجتماعیت کا تصور پایا جاتا ہے۔ مثلاً باجماعت نماز ادا کرنا، مل جل کر سحر و افطار کرنا، حج کا اجتماع اور زکوٰۃ کی صورت میں اجتماعی فلاح کے لئے کوشش کرنا وغیرہ۔

سیرت طیبہ ﷺ سے بھی گھر والوں کے ساتھ مل کر وقت گزارنے، کھانا ساتھ کھانے اور ہمدردی و غمگساری کی بہت زیادہ ترغیب ملتی ہے۔ ایسے گھرانے جہاں پیغمبرانہ تعلیمات کا فہم پایا

جاتا ہے اس کے اراکین ایک دوسرے کے لئے اعتماد، خلوص اور وفاداری کے جذبات رکھتے ہیں حق اور فرض کی ادائیگی کا گہرا احساس رکھتے ہیں ان کے درمیان موثر ربط قائم رہتا ہے۔ اس یونٹ سے نشو ونما پانے والا نوجوان طبقہ معاشرے کی تعمیری سرگرمیوں میں فعال کردار ادا کرتا ہے اس کی شخصیت میں سماج کو قبول کرنے کے حوالے سے بھرپور اعتماد پایا جاتا ہے۔ کامیاب اور مستحکم خاندان بحران اور مسائل میں مبتلا ہو جائیں تو انتشار کا شکار نہیں ہوتے بلکہ ان مسائل سے نمٹنے میں ان کے باہمی تعلقات کی مضبوطی، اعتماد اور مذہبی اقدار ان کو آسانیاں فراہم کر دیتی ہیں۔

مضبوط خاندانی نظام میں کسی فیملی میں والدین میں سے کسی ایک کا اچانک انتقال کر جانا، بڑے بہن بھائیوں کو نئی صورت حال اور ذمہ داریاں سے نمٹنے کے لئے تیار کر دیتا ہے یا والدین کے ہوتے ہوئے بھی بڑی بہن یا بھائی کا اپنے والدین اور چھوٹے بہن بھائیوں کے لئے فرائض کی ادائیگی اور ذمہ داری کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ اس تمام عمل کے لئے جس شعوری ہم آہنگی کی ضرورت ہوتی ہے وہ ایک مضبوط اور مستحکم خاندان ہی فراہم کر سکتا ہے۔

معاشرتی استحکام

آخر کار ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ فرد کی تربیت میں خاندان کا کردار اولین حیثیت رکھتا ہے اور اس ادارے کے استحکام، توازن اور بقا کے بغیر کسی بھی معاشرے کی تہذیبی و روایتی اقدار، روحانی و مذہبی زندگی اور اجتماعیت کا تصور بھی محال ہے۔ خاندان کے اس کردار سے لازماً معاشرہ بھی متاثر ہوتا ہے کیونکہ اس کے افراد کے مختلف درجات بہر حال معاشرے میں ہی نمایاں ہوتے ہیں اور جانچے جاتے ہیں۔

جس معاشرہ کا یونٹ یعنی خاندان اجتماعی سوچ سے محروم ہو، سماجی ذمہ داریوں کے صحیح طور پر ادا کرنے سے قاصر ہو، وہ معاشرہ بھی اخلاقی اقدار کی کمی، معاشی بحران، علم کی کمی، مادیت پرستی، رسم و رواج کی اندھی تقلید، جذباتی عدم توازن اور دیگر نت نئے مسائل سے دوچار ہوتا چلا جاتا ہے۔ اگر افراد کی اصلاح ہو جائے اور خاندان مستحکم ہو جائیں تو معاشرے میں بھی مثبت تبدیلیوں سے بہرہ ور ہونے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

(مأخوذ از ماہنامہ الملنگیہ اوکاڑہ)

مسلمانوں کی موجودہ

پستی کا واحد علاج

تجویز فرمودہ

حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحب قدس سرہ

مرتبہ

حضرت مولانا محمد احتشام الحسن صاحب کاندھلوی

شائع کردہ صفہ پبلشرز 19۔اے ایبٹ روڈ لاہور

اظہارِ حقیقت

نحمدہ ونصلی علٰی رسولہ الکریم

سیدی ومولائی زُبدۃُ الفضلاء قدوۃ العلماء حضرت مولانا محمد الیاس صاحب دام مجدہ کے خاص شغف اور انہماک اور دیگر بزرگان ملت اور علماء امت کی توجہ اور برکت اور عملی جدوجہد سے ایک عرصہ سے مخصوص انداز میں تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کا سلسلہ جاری ہے جس سے باخبر طبقہ بخوبی واقف ہے۔ مجھ بے علم اور سیاہ کار کو ان مقدس ہستیوں کا حکم ہوا کہ اس طرز تبلیغ اور اس کی ضرورت اور اہمیت کو قلم بند کیا جائے تاکہ سمجھنے اور سمجھانے میں آسانی ہو اور نفع عام ہو جائے۔ تعمیل ارشاد میں یہ چند کلمات نذر قرطاس کیے جاتے ہیں جو ان مقدس ہستیوں کے دریائے علوم ومعارف کے چند قطرے اور اس باغیچۂ دین محمدی کے چند خوشے ہیں جو انتہائی عجلت میں جمع کیے گئے ہیں۔ اگر ان میں کوئی غلطی یا کوتاہی نظر سے گزرے تو میری لغزش قلم اور بے علمی کا نتیجہ ہے۔ نظر لطف وکرم سے اس کی اصلاح فرمادیں تو موجب شکر ومنت ہوگا۔

حق تعالیٰ شانہ اپنے فضل وکرم سے میری بداعمالیوں اور سیاہ کاریوں کی پردہ پوشی فرمادیں اور مجھے اور آپ کو ان مقدس ہستیوں کے طفیل سے اچھے اعمال اور اچھے کردار نصیب فرمادیں اور اپنی رضا ومحبت اور اپنے پسندیدہ دین کی اشاعت اور اپنے برگزیدہ رسول ﷺ کی اطاعت اور فرمان برداری کی دولت سے سرفراز فرمادیں۔

خاکپائے بزرگاں محمد احتشام الحسن

مدرسہ کاشف العلوم بستی حضرت نظام الدین اولیاء دہلی ۱۸ ربیع الثانی ۱۳۵۸ھ

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العٰلمین والصلاۃ والسلام علٰی سید الاوّلین و الاخرین

خـاتـم الانبیـاء و الـمـرسـلین محمد و الہٖ و اصحابہٖ الطیبین الطاھرین

آج سے تقریباً ساڑھے تیرہ سو سال قبل جب دنیا کفر وضلالت، جہالت وسفاہت کی تاریکیوں میں گھری ہوئی تھی۔ بطحا کی سنگ لاخ پہاڑیوں سے رشد و ہدایت کا ماہتاب نمودار ہوا اور مشرق ومغرب، شمال وجنوب غرض دنیا کے ہر ہر گوشہ کو اپنے نور سے منور کیا اور 23 سال کے قلیل عرصہ میں بنی نوع انسان کو اس معراجِ ترقی پر پہنچایا کہ تاریخ عالم اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے اور رشد و ہدایت، صلاح وفلاح کی وہ مشعل مسلمانوں کے ہاتھ میں دی جس کی روشنی میں ہمیشہ شاہراہِ ترقی پر گامزن رہے اور صدیوں اس شان وشوکت سے دنیا پر حکومت کی کہ ہر مخالف قوت کو ٹکرا کر پاش پاش ہونا پڑا۔ یہ ایک حقیقت ہے جو ناقابل انکار ہے لیکن پھر بھی ایک پارینۂ داستاں ہے جس کا بار بار دہرانا' نہ تسلی بخش ہے اور نہ کارآمد اور مفید، جب کہ موجودہ مشاہدات اور واقعات خود ہماری سابقہ زندگی اور ہمارے اسلاف کے کارناموں پر بدنما داغ لگا رہے ہیں۔

مسلمانوں کی تیرہ سو سالہ زندگی کو جب تاریخ کے اوراق میں دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم عزت وعظمت، شان وشوکت، دبدبہ وحشمت کے تنہا مالک اور اجارہ دار ہیں لیکن جب ان اوراق سے نظر ہٹا کر موجودہ حالات کا مشاہدہ کیا جاتا ہے تو ہم انتہائی ذلت وخواری، افلاس وناداری میں مبتلا نظر آتے ہیں، نہ زور وقوت ہے، نہ زر ودولت ہے، نہ شان وشوکت ہے، نہ باہمی اخوت والفت، نہ عادات اچھی، نہ اخلاق اچھے، نہ اعمال اچھے نہ کردار اچھے۔ ہر برائی ہم میں موجود اور ہر بھلائی سے کوسوں دور۔ اغیار ہماری اس زبوں حالی پر خوش ہیں اور برملا ہماری کمزوری کو اچھالا جاتا ہے اور ہمارا مضحکہ اڑایا جاتا ہے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ خود ہمارے جگر گوشے نئی تہذیب کے دلدادہ نوجوان' اسلام کے مقدس اصولوں کا مذاق اڑاتے ہیں، بات بات پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں اور اس شریعت مقدسہ کو ناقابل عمل، لغو اور بیکار گردانتے ہیں۔ عقل حیران ہے کہ

جس قوم نے دنیا کو سیراب کیا وہ آج کیوں تشنہ ہے؟ جس قوم نے دنیا کو تہذیب وتمدن کا سبق پڑھایا وہ آج کیوں غیر مہذب اور غیر متمدن ہے؟

رہنمایانِ قوم نے آج سے بہت پہلے ہماری اس حالت زار کا اندازہ لگایا اور مختلف طریقوں پر ہماری اصلاح کے لئے جدوجہد کی مگر ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

آج جب کہ حالت بد سے بدتر ہو چکی اور آنے والا زمانہ ماسبق سے بھی زیادہ پرخطر اور تاریک نظر آ رہا ہے، ہمارا خاموش بیٹھنا اور عملی جدوجہد نہ کرنا ایک ناقابل تلافی جرم ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم کوئی عملی قدم اٹھائیں، ضروری ہے کہ ان اسباب پر غور کریں جن کے باعث ہم اس ذلت و خواری کے عذاب میں مبتلا کیے گئے ہیں۔ ہماری اس پستی اور انحطاط کے مختلف اسباب بیان کیے جاتے ہیں اور ان کے ازالہ کی متعدد تدابیر اختیار کی گئیں لیکن ہر تدبیر ناموافق و ناکام ثابت ہوئی جس کے باعث ہمارے رہبر بھی یاس و ہراس میں گھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ اب تک ہمارے مرض کی تشخیص ہی پورے طور پر نہیں ہوئی' جو کچھ اسباب بیان کیے جاتے ہیں اصل مرض نہیں بلکہ اس کے عوارض ہیں پس تاوقتیکہ اصل مرض کی جانب توجہ نہ ہوگی اور مادہ حقیقی کی اصلاح نہ ہوگی' عوارض کی اصلاح ناممکن اور محال ہے پس جب تک کہ ہم اصل مرض کی ٹھیک تشخیص اور اس کا صحیح علاج معلوم نہ کر لیں' ہمارا اصلاح کے بارے میں لب کشائی کرنا سخت ترین غلطی ہے۔

ہمارا یہ دعویٰ کہ ہماری شریعت ایک مکمل قانونِ الٰہی ہے جو ہماری دینی اور دنیوی فلاح و بہبود کا تا قیامِ قیامت ضامن ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم خود ہی اپنا مرض تشخیص کریں اور خود ہی اس کا علاج شروع کر دیں، بلکہ ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم قرآنِ حکیم سے اپنا اصل مرض معلوم کریں اور اسی مرکز رشد و ہدایت سے طریق علاج معلوم کر کے اس پر کاربند ہوں جب قرآن حکیم قیامت تک کے لئے مکمل دستور العمل ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس نازک حالت میں ہماری رہبری سے قاصر رہے۔ مالکِ ارض وسما جل وعلا کا سچا وعدہ ہے کہ روئے زمین کی بادشاہت وخلافت مؤمنوں کے لئے ہے:

وَ عَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي

الْاَرْضِ ..... (النور۔55)

''اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح کیے کہ ان کو ضرور روئے زمین کا خلیفہ بنائے گا.....''

اور یہ بھی اطمینان دلایا ہے کہ مؤمن ہمیشہ کفار پر غالب رہیں گے اور کافروں کا کوئی یار و مددگار نہ ہوگا:

وَ لَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا (الفتح۔22)

''اور اگر تم سے یہ کافر لڑتے تو ضرور پیٹھ پھیر کر بھاگتے۔ پھر نہ پاتے کوئی یار و مددگار''

اور مؤمنوں کی نصرت اور مدد اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اور وہی ہمیشہ سربلند اور سرفراز رہیں گے۔

وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (الروم۔47)

''اور حق ہے ہم پر مدد ایمان والوں کی''

وَلَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آل عمران۔139)

''اور تم ہمت مت ہارو اور رنج مت کرو اور غالب تم ہی رہو گے اگر تم پورے مؤمن رہے''

وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ (المنافقون۔8)

''اور اللہ ہی کی ہے عزت اور اس کے رسول کی اور مسلمانوں کی''

مذکورہ بالا ارشادات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی عزت، شان و شوکت، سربلندی و سرفرازی اور ہر برتری و خوبی ان کی صفت ایمان کے ساتھ وابستہ ہے اگر ان کا تعلق خدا اور رسول ﷺ کے ساتھ مستحکم ہے (جو ایمان کا مقصود ہے) تو سب کچھ ان کا ہے اور اگر خدانخواستہ اس رابطہ تعلق میں کمی اور کمزوری پیدا ہوگئی ہے تو پھر سراسر خسران اور ذلت و خواری ہے جیسا کہ واضح طور پر بتلا دیا گیا ہے:

و العصر ○ ان الانسان لفی خسر ○ الاالذین امنوا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ و تواصوا بالحق وتواصوا بالصبر ○ (سورۃ العصر)

''قسم ہے زمانہ کی انسان بڑے خسارے میں ہے مگر جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے اور ایک دوسرے کو حق کی فہمائش کرتے رہے اور ایک دوسرے کو

پابندی کی فہمائش کرتے رہے۔''

ہمارے اسلاف عزت کے منتہا کو پہنچے ہوئے تھے اور ہم انتہائی ذلت وخواری میں مبتلا ہیں پس معلوم ہوا کہ وہ کمالِ ایمان سے متصف تھے اور ہم اس نعمت عظمیٰ سے محروم ہیں۔ جیسا کہ مخبر صادق ﷺ نے خبر دی ہے:

سیاتی علی الناس زمان لایبقٰی من الاسلام الا اسمه ولا من القراٰن الا رسمه (مشکاۃ)

''یعنی قریب ہی ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ اسلام کا صرف نام باقی رہ جائے گا اور قرآن کے صرف نقوش رہ جائیں گے''

اب غور طلب امر یہ ہے کہ اگر واقعی ہم اس حقیقی اسلام سے محروم ہو گئے جو خدا اور رسول ﷺ کے یہاں مطلوب ہے اور جس کے ساتھ ہمارے دین ودنیا کی فلاح و بہبود وابستہ ہے تو کیا ذریعہ ہے جس سے وہ کھوئی ہوئی نعمت واپس آئے؟ اور وہ کیا اسباب ہیں جن کی وجہ سے روحِ اسلام ہم سے نکال لی گئی اور ہم جسدِ بے جان رہ گئے۔

جب مصحف آسمانی کی تلاوت کی جاتی ہے اور ''امت محمدیہؐ'' کی فضیلت اور برتری کی علت وغایت ڈھونڈھی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس امت کو ایک اعلیٰ اور برتر کام سپرد کیا گیا تھا جس کی وجہ سے ''خیر الامم'' کا معزز خطاب اس کو عطا کیا گیا۔

دنیا کی پیدائش کا مقصدِ اصلی خدا وحدہٗ لاشریک لہٗ کی ذات وصفات کی معرفت ہے اور یہ اس وقت تک ناممکن ہے کہ جب تک بنی نوع انسان کو برائیوں اور گندگیوں سے پاک کر کے بھلائیوں اور خوبیوں کے ساتھ آراستہ نہ کیا جائے۔ اسی مقصد کے لئے ہزاروں رسول اور نبی بھیجے گئے اور آخر میں اس مقصد کی تکمیل کے لئے سید الانبیا والمرسلین ﷺ کو مبعوث فرمایا اور اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ کا مژدہ سنایا گیا۔

اب چونکہ مقصد کی تکمیل ہو چکی تھی، ہر بھلائی اور برائی کو کھول کھول کر بیان کر دیا گیا تھا، ایک مکمل نظامِ عمل دیا جا چکا تھا، اس لئے رسالت ونبوت کے سلسلہ کو ختم کر دیا گیا اور جو کام پہلے نبی اور رسول سے لیا جاتا تھا وہ قیامت تک امت محمدیہؐ کے سپرد کر دیا گیا۔

كُنتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران۔110)

''اے امت محمد یہ! تم افضل امت ہو تم کو لوگوں کے نفع کے لئے بھیجا گیا ہے تم بھلی باتوں کو لوگوں میں پھیلاتے ہو اور بری باتوں سے ان کو روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو''

وَ لْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ O (آل عمران۔104)

''اور چاہیے کہ تم میں ایسی جماعت ہو کہ لوگوں کو خیر کی طرف بلائے اور بھلی باتوں کا حکم کرے، اور بری باتوں سے منع کرے اور صرف وہی لوگ فلاح والے ہیں جو اس کام کو کرتے ہیں۔''

پہلی آیت میں ''خیر اُمم'' ہونے کی وجہ یہ بتلائی کہ تم بھلائی کو پھیلاتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔ دوسری آیت میں حصر کے ساتھ فرمادیا کہ فلاح و بہبود صرف انہی لوگوں کے لئے ہے جو اس کام کو انجام دے رہے ہیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ دوسری جگہ صاف طور پر بیان کر دیا گیا کہ اس کام کو انجام نہ دینا لعنت اور پھٹکار کا موجب ہے۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْ اِسْرَآءِ يْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ O كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ O(المائدۃ۔ 79,78)

''بنی اسرائیل میں جو لوگ کافر تھے ان پر لعنت کی گئی تھی داؤد علیہ السلام اور عیسٰی بن مریم علیہ السلام کی زبان سے۔ یہ لعنت اس سبب سے ہوئی کہ انھوں نے حکم کی مخالفت کی اور حد سے نکل گئے جو برا کام انھوں نے کر رکھا تھا اس سے باز نہ آتے تھے واقعی ان کا یہ فعل بے شک برا تھا''

اس آخری آیت کی مزید وضاحت احادیث ذیل سے ہوتی ہے:

(1) وفی السنن والمسند من حدیث عبداللّٰہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قال:

قـال رسـول الـلّٰه ﷺ إِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَانَ إِذَا عَمِلَ الْعَامِلَ فِيْهِمْ بِـالْـخَـطِيْئَةِ جَاءَهُ النَّاهِيُ تَعْزِيْرًا فَقَالَ يَاهٰذَا اتَّقِ اللّٰهَ فَإِذَا كَانَ مِنَ الْغَدِ جَـالَسَـهُ وَ اٰكَـلَـهُ وَ شَارَبَهُ كَأَنَّهُ لَمْ يَرَهُ عَلٰى خَطِيْئَةٍ بِالْأَمْسِ فَلَمَّا رَاٰى عَـزَّوَجَلَّ ذَالِكَ مِنْهُمْ ضَرَبَ قُلُوْبَ بَعْضِهِمْ عَلٰى بَعْضٍ ثُمَّ لَعَنَهُمْ عَلٰى لِسَـانِ نَبِيِّهِمْ دَاوٗدَ وَ عِيْسَى بْنِ مَرْيَمَ ذَالِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ وَ الَّـذِيْ نَـفْـسُ مُـحَـمَّـدٍ بِيَدِهٖ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَ لَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ لَتَـأْخُـذُنَّ عَـلٰـى يَـدِ السَّـفِيْهِ وَ لَتَأْطُرُنَّ عَلَى الْحَقِّ اَطْرًا أَوْ لَيَضْرِبَنَّ اللّٰهُ قُلُوْبَ بِعْضِكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ثُمَّ يَلْعَنَكُمْ كَمَا لَعَنَهُمْ

''حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے ارشادفرمایا: کہ تم سے پہلی امتوں میں جب کوئی خطا کرتا تو روکنے والا اس کو دھمکاتا اور کہتا کہ خدا سے ڈر، پھر اگلے ہی دن اس کے ساتھ اٹھتا، بیٹھتا، کھاتا، پیتا گویا کل اس کو گناہ کرتے ہوئے دیکھا ہی نہیں۔ جب حق ﷻ نے ان کا یہ برتاؤ دیکھا تو بعض کے قلوب کو بعض کے ساتھ خلط کردیا اوران کے نبی داود اور عیسیٰ بن مریم علیہاالسلام کی زبانی ان پر لعنت کی اور یہ اس لئے کہ انھوں نے خدا کی نافرمانی کی اور حد سے تجاوز کیا۔قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے' تم ضرور اچھی باتوں کا حکم کرو اور بری باتوں سے منع کرو۔اور چاہیے کہ بیوقوف نادان کا ہاتھ پکڑ و اس کو حق بات پر مجبور کرو، ورنہ حق تعالیٰ تمہارے قلوب کو بھی خلط ملط کردیں گے،اور پھر تم پر بھی لعنت ہوگی جیسا کہ پہلی امتوں پر لعنت ہوئی۔''

(2) و فـی سـنـن ابـی داؤد وابـن ماجة عن جرير بن عبداللّٰه ؓ قال: سمعت رسول اللّٰه ﷺ يقول: مَا مِنْ رَّجُلٍ يَكُوْنُ فِيْ قَوْمٍ يَعْمَلُ فِيْهِمْ بِـالْـمَـعَـاصِيْ يَقْدِرُوْنَ عَلٰى اَنْ يُّغَيِّرُوْا عَلَيْهِ و لَايُغَيِّرُوْنَ اِلَّا اَصَابَهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابٍ قَبْلَ اَنْ يَّمُوْتُوْا

''حضرت جریر ؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے ارشادفرمایا کہ اگر کسی

جماعت اور قوم میں کوئی شخص گناہ کرتا ہے اور وہ قوم باوجود قدرت کے اس کو نہیں روکتی تو ان پر مرنے سے پہلے ہی حق تعالیٰ اپنا عذاب بھیج دیتے ہیں یعنی دنیا ہی میں ان کو طرح طرح کے مصائب میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔''

(3) و روی الاصبهانی عن أنس ﷺ ان رسول الله ﷺ قَالَ: لَاتَزَالُ "لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـه" تَنْفَعُ مَنْ قَالَهَا وَ تَرُدُّ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ النِّقْمَةُ مَا لَمْ يَسْتَخِفُّوْا بِحَقِّهَا قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا الْاِسْتِخْفَافُ بِحَقِّهَا؟ قَالَ يَظْهُرُ الْعَمَلُ بِمَعَاصِى اللّٰهِ فَلَايُنْكَرُ وَ لَايُغَيِّرُ (ترغيب)

''حضرت انس ﷺ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ہمیشہ کلمہ ''لا الٰہ الا اللہ' اپنے پڑھنے والے کو نفع دیتا ہے اور اس سے عذاب وبلا دور کرتا ہے جب تک کہ اس کے حقوق سے بے پرواہی نہ برتی جائے۔ صحابہ ﷺ نے عرض کیا: اس کے حقوق کی بے پرواہی کیا ہے؟ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حق تعالیٰ کی نافرمانی کھلے طور پر کی جائے پھر نہ ان کا انکار کیا جائے اور نہ ان کے بند کرنے کی کوشش کی جائے۔''

(4) عن عائشة رضى الله عنها قالت: دخل علىَّ النبى ﷺ فعرفت فى وجهه أن قدحضره شئ فتوضا و ما كلم أحدًا فلصقت بالحجرة أستمع مايقول فقعد على المنبر فحمد الله وأثنٰى عليه وقال: يآايها الناس إن اللّٰه تعالٰى يقول لكم: مروا بالمعروف و انهوا عن المنكر قبل ان تدعوا فلااجيب لكم و تسألونى فلا أعطيكم وتستنصرونى فلاأنصركم فما زاد عليهن حتى نزل (ترغيب)

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول خدا ﷺ میرے پاس تشریف لائے تو میں نے چہرہ انور پر ایک خاص اثر دیکھ کر محسوس کیا کہ کوئی اہم بات پیش آئی ہے۔ حضور اقدس ﷺ نے کسی سے کوئی بات نہیں کی اور وضو فرما کر مسجد میں تشریف لے گئے میں مسجد کی دیوار سے لگ گئی تا کہ کوئی ارشاد ہو اس کو سنوں؛ حضور اقدس ﷺ منبر پر

جلوہ افروز ہوئے اور حمد وثنا کے بعد فرمایا: ''لوگو! اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ بھلی باتوں کا حکم کرو اور بری باتوں سے منع کرو، مبادا وہ وقت آ جائے کہ تم دعا مانگو اور میں اس کو قبول نہ کروں اور تم مجھ سے سوال کرو اور میں اس کو پورا نہ کروں اور تم مجھ سے مدد چاہو اور میں تمہاری مدد نہ کروں۔ حضور اقدس ﷺ نے صرف یہ کلمات ارشاد فرمائے اور منبر سے اتر گئے۔''

(5) عن أبی هريرة ﷺ قال: قال رسول الله ﷺ: إذا عظمت أُمتی الدنيا نزعت منها هيبة الاسلام و إذا تركت الامر بالمعروف و النهی عن المنكر حرمت بركة الوحی و إذا تسابت أمتی سقطت من عين اللّٰه (كذافی الدرعن الحكيم الترمذی)

''حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب میری امت دنیا کو قابل وقعت وعظمت سمجھنے لگے گی تو اسلام کی وقعت و ہیبت ان کے قلوب سے نکل جائے گی اور جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دے گی تو وحی کی برکات سے محروم ہو جائے گی اور جب آپس میں ایک دوسرے کو سب وشتم کرنا اختیار کرے گی تو اللہ جل شانہ کی نگاہ سے گر جائے گی۔''

احادیث مذکورہ پر غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوئی کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو چھوڑ نا خدا وحدہ لاشریک لہ کی لعنت اور غضب کا باعث ہے اور جب امۃ محمدؐ یہ اس کام کو چھوڑ دے گی تو سخت مصائب وآلام اور ذلت وخواری میں مبتلا کر دی جائے گی اور ہر قسم کی غیبی نصرت و مدد سے محروم ہو جائے گی اور یہ سب کچھ اس لئے ہوگا کہ اس نے اپنے فرض منصبی کو نہیں پہچانا اور جس کام کی انجام دہی کی ذمہ دار تھی اس سے غافل رہی۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو ایمان کا خاصہ اور جزو لازمی قرار دیا اور اس کے چھوڑنے کو ایمان کے ضعف واضمحلال کی علامت بتلایا۔ حدیث ابوسعید خدری ﷺ میں ہے: من رای منكم منكرا فليغيره بيده فان لم يستطع فبلسانه فان لم يستطع فبقلبه و ذلك أضعف الايمان (مسلم) یعنی تم میں سے جب کوئی شخص برائی کو دیکھے تو چاہیے کہ اپنے ہاتھوں سے کام

لے کر اس کو دور کرے اور اگر اس کی طاقت نہ پائے تو زبان سے، اور اگر اسکی بھی طاقت نہ پائے تو دل سے اور یہ آخری صورت ایمان کی بڑی کمزوری کا درجہ ہے۔ پس جس طرح آخری درجہ اضعف ایمان کا ہوا، اسی طرح پہلا درجہ کمال دعوت اور کمال ایمان کا ہوا۔ اس سے بھی واضح تر حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ہے:

مامن نبی بعثه اللّٰه قبلی الا کان له فی امته حواریون و اصحاب یاخذون بسنته و یقتدون بامره ثم انها تخلف من بعدهم خلوف یقولون مالا یفعلون و یفعلون ما لایؤمرون فمن جاهدهم بیده فهو مؤمن ومن جاهدهم بلسانه فهو مؤمن و من جاهدهم بقلبه فهو مؤمن و لیس وراء ذالك من الایمان حبة خردل (مسلم)

یعنی سنت الٰہی یہ ہے کہ ہر نبی اپنے ساتھیوں اور تربیت یافتہ یاروں کی ایک جماعت چھوڑ جاتا ہے۔ یہ جماعت نبی کی سنت کو قائم رکھتی ہے اور ٹھیک ٹھیک اس کی پیروی کرتی ہے یعنی شریعت الٰہی کو جس حال اور جس شکل میں نبی چھوڑ گیا ہے اس کو بعینہٖ محفوظ رکھتے ہیں اور اس میں ذرا بھی فرق نہیں آنے دیتے لیکن اس کے بعد شر و فتن کا دور آتا ہے اور ایسے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں جو طریقۂ نبی سے ہٹ جاتے ہیں۔ ان کا فعل ان کے دعوے کے خلاف ہوتا ہے اور ان کے کام ایسے ہوتے ہیں جن کے لئے شریعت نے حکم نہیں دیا۔ سو ایسے لوگوں کے خلاف جس شخص نے قیام حق وسنت کی راہ میں اپنے ہاتھ سے کام لیا وہ مؤمن ہے، اور جو ایسا نہ کر سکا مگر زبان سے کام لیا وہ بھی مومن ہے اور جس سے یہ بھی نہ ہو سکا اور دل کے اعتقاد اور نیت کے ثبات کو ان کہ خلاف کام میں لایا وہ بھی مومن ہے لیکن آخری درجہ کے بعد ایمان کا کوئی درجہ نہیں اس پر ایمان کی سرحد ختم ہو جاتی ہے۔ حتی کہ اب رائی کے دانے برابر بھی ایمان نہیں ہو سکتا۔

اس کام کی اہمیت اور ضرورت کو امام غزالی رحمہ اللہ نے اس طرح ظاہر فرمایا ہے:

''اس میں کچھ شک نہیں کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر دین کا ایسا زبردست رکن ہے جس سے دین کی تمام چیزیں وابستہ ہیں۔ اس کو انجام دینے کے لئے حق تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام علیہم السلام کو مبعوث فرمایا۔ اگر خدانخواستہ اس کو بالائے طاق رکھ دیا جائے اور اس کے علم وعمل کو

ترک کردیا جائے تو العیاذ باللہ نبوت کا بیکار ہونا لازم آئے گا۔ دیانت جو شرافت انسانی کا خاصہ ہے، مضمحل اور افسردہ ہو جائے گی، کاہلی اور سستی عام ہو جائے گی، گمراہی اور ضلالت کی شاہراہیں کھل جائیں گی، جہالت عالمگیر ہو جائے گی، تمام کاموں میں خرابی آ جائے گی، آپس میں پھوٹ پڑ جائے گی، آبادیاں خراب ہو جائیں گی، مخلوق تباہ و برباد ہو جائے گی اور اس تباہی اور بربادی کی اس وقت خبر ہوگی جب روز محشر خدائے بالا و برتر کے سامنے پیشی اور باز پرس ہوگی۔

افسوس صد افسوس! جو خطرہ تھا وہ سامنے آ گیا جو کھٹکا تھا آنکھوں نے دیکھ لیا۔ کان امر اللّٰہ قدرا مقدورا۔ فإنا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔

اس سرسبز ستون کے علم و عمل کے نشانات مٹ چکے، اس کی حقیقت و رسوم کی برکتیں نیست و نابود ہو گئیں، لوگوں کی تحقیر و تذلیل کا سکہ قلوب پر جم گیا، خدائے پاک کے ساتھ کا قلبی تعلق مٹ چکا اور نفسانی خواہشات کے اتباع میں جانوروں کی طرح بے باک ہو گئے، روئے زمین پر ایسے صادق مؤمن کا ملنا دشوار و کمیاب ہی نہیں بلکہ معدوم ہو گیا جو اظہار حق کی وجہ سے کسی کی ملامت گوارا کرے۔ اگر کوئی مرد مؤمن اس تباہی اور بربادی کے ازالہ میں سعی کرے اور اس سنت کے احیاء میں کوشش کرے اور اس مبارک بوجھ کو لے کر کھڑا ہو اور آستینیں چڑھا کر اس سنت کے زندہ کرنے کے لئے میدان میں آئے تو یقیناً وہ شخص تمام مخلوق میں ایک ممتاز اور نمایاں ہستی کا مالک ہوگا۔''

امام غزالی رحمہ اللہ نے جن الفاظ میں اس کام کی اہمیت اور ضرورت کو بیان کیا ہے وہ ہماری تنبیہ اور بیداری کے لئے کافی ہیں۔

ہمارے اس قدر اہم فریضہ سے غافل ہونے کی چند وجوہ معلوم ہوتی ہیں:

پہلی وجہ ——— یہ ہے کہ ہم نے اس فریضہ کو علماء کے ساتھ خاص کر لیا حالانکہ خطابات قرآنی عام ہیں جو امت محمدیہ کے ہر ہر فرد کو شامل ہیں اور صحابہ کرام ﷺ اور خیر القرون کی زندگی اس کے لئے شاہد عدل ہے۔ فریضۂ تبلیغ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو علماء کے ساتھ خاص کر لینا اور پھر ان کے بھروسہ پر اس اہم کام کو چھوڑ دینا ہماری سخت نادانی ہے۔ علماء کا کام راہ حق بتلانا اور سیدھا راستہ دکھلانا ہے، پھر اس کے موافق عمل کرنا اور مخلوق خدا کو اس پر چلانا یہ دوسرے لوگوں کا کام ہے،

اس کی جانب اس حدیث شریف میں تنبیہ کی گئی ہے:

ألا كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته فالامير الذى على الناس راع عليهم و هو مسئول عنهم و الرجل راع على اهل بيته و هو مسئول عنهم و المرأة راعية على بيت بعلها و ولده و هى مسئولة عنهم و العبد راع على مال سيد ه و هو مسئول عنه فكلكم راع و كلكم مسئول عن رعيته (بخاری ومسلم)

''بے شک تم سب کے سب نگہبان ہو اور تم سب اپنی رعیت کے بارے میں سوال کیے جاؤ گے۔ پس بادشاہ لوگوں پر نگہبان ہے وہ اپنی رعیت کے بارے میں سوال کیا جاوے گا اور مرد اپنے گھر والوں پر نگہبان ہے اور اس سے ان کے بارے میں سوال کیا جاوے گا اور عورت اپنے خاوند کے گھر اور اولاد پر نگہبان ہے وہ ان کے بارے میں سوال کی جاوے گی اور غلام اپنے مالک کے مال پر نگہبان ہے اس سے اس کے بارے میں سوال کیا جاوے گا۔ پس تم سب نگہبان ہو اور تم سب سے اپنی رعیت کے بارے میں سوال کیا جاوے گا۔''

اور اسی کو واضح طور پر اس طرح بیان فرمایا ہے:

قال: الدين النصيحة، قلنا لمن؟ قال: لله ولرسوله ولأئمة المسلمين وعامَّتِهم (مسلم)

''حضور اقدس ﷺ نے فرمایا دین سراسر نصیحت ہے (صحابہ رضی اللہ عنہم نے) عرض کیا کس کے لئے؟ فرمایا اللہ کے لئے اور اللہ کے رسول کے لئے اور مسلمانوں کے مقتداؤں کے لئے اور عام مسلمانوں کے لئے۔''

اگر بفرض محال مان بھی لیا جائے کہ یہ علماء کا کام ہے تب بھی اس وقت فضائے زمانہ کا مقتضا یہی ہے کہ ہر شخص اس کام میں لگ جائے اور اعلائے کلمۃ اللہ اور حفاظت دین متین کے لئے کمر بستہ ہو جائے۔

دوسری وجہ ـــــــ یہ کہ ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ اگر ہم خود اپنے ایمان میں پختہ ہیں تو دوسروں کی

گمراہی ہمارے لئے نقصان دہ نہیں جیسا کہ اس آیت شریفہ کا مفہوم ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَایَضُرُّکُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ (المائدۃ۔105)

''اے ایمان والو! اپنی فکر کرو جب تم راہ پر چل رہے ہو تو جو شخص گمراہ ہے اس سے تمہارا کوئی نقصان نہیں۔'' (بیان القرآن)

لیکن درحقیقت آیت سے یہ مقصود نہیں جو ظاہر میں سمجھا جارہا ہے اس لئے کہ یہ معنی حکمت خداوندیہ اور تعلیمات شرعیہ کے بالکل خلاف ہیں۔ شریعت اسلامی نے اجتماعی زندگی اور اجتماعی اصلاح اور اجتماعی ترقی کو اصل بتلایا ہے اور امت مسلمہ کو بمنزلہ ایک جسم کے قرار دیا ہے کہ اگر ایک عضو میں درد ہو جائے تو تمام جسم بے چین ہو جاتا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ بنی نوع انسان خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے اور کمال کو پہنچ جاوے اس میں ایسے لوگوں کا ہونا بھی ضروری ہے جو سیدھے راستے کو چھوڑ کر گمراہی میں مبتلا ہوں تو آیت میں مومنوں کے لئے تسلی ہے کہ جب تم ہدایت اور صراط مستقیم پر قائم ہو تو تم کو ان لوگوں سے مضرت کا اندیشہ نہیں جنہوں نے بھٹک کر سیدھا راستہ چھوڑ دیا۔

نیز اصل ہدایت یہ ہے کہ انسان شریعت محمدیہ کو مع تمام احکام کے قبول کرے اور منجملہ احکام خداوندی کے ایک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی ہے۔

ہمارے اس قول کی تائید حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ارشاد سے ہوتی ہے:

عن ابی بکر الصد یق رضی اللہ عنہ قال ایھا الناس انکم تقرء ون ھٰذہ الایۃ ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَایَضُرُّکُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ'' فانی سمعت رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: ان الناس اذا رأو المنکر فلم یغیروہ اوشك ان یعمھم اللّٰہ بعقابہ

''حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے لوگو تم یہ آیت ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَایَضُرُّکُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ '' پیش کرتے ہو اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب لوگ خلاف شرع کسی چیز کو دیکھیں اور

اس میں تغیر نہ کریں تو قریب ہے کہ حق تعالیٰ ان لوگوں کو اپنے عمومی عذاب میں مبتلا فرمادے۔''

علماء محققین نے بھی اس آیت کے یہی معنی لئے ہیں۔امام نووی رحمہ اللہ شرح مسلم میں فرماتے ہیں:

''علماء محققین کا صحیح مذہب اس آیت کے معنی میں یہ ہے کہ جب تم اس چیز کو ادا کر دو جس کا تمھیں حکم دیا گیا ہے تو تمہارے غیر کی کوتاہی تمھیں مضرت نہ پہنچائے گی جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰی ۔ اور جب ایسا ہے تو منجملہ ان اشیاء کے جن کا حکم دیا گیا امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے پس جب کسی شخص نے اس حکم کو پورا کر دیا اور مخاطب نے اس کی تعمیل نہ کی تو اب ناصح پر کوئی عتاب اور سرزنش نہیں،اس لئے کہ جو کچھ اس کے ذمہ واجب تھا اور وہ امر ونہی ہے اس نے اس کو ادا کر دیا،دوسرے کا قبول کرنا اس کے ذمے نہیں۔واللہ اعلم''۔

تیسری وجہ ـــــــ یہ ہے کہ عوام وخواص، عالم وجاہل ہر شخص اصلاح سے مایوس ہو گیا اور انھیں یقین ہو گیا کہ اب مسلمانوں کی ترقی اور ان کا عروج ناممکن اور دشوار ہے۔ جب کسی شخص کے سامنے کوئی اصلاحی نظام پیش کیا جاتا ہے تو جواب یہی ملتا ہے کہ مسلمانوں کی ترقی اب کیسے ہو سکتی ہے جب کہ ان کے پاس نہ سلطنت وحکومت ہے، نہ مال وزر اور نہ سامانِ حرب اور نہ مرکزی حیثیت، نہ قوت بازو اور نہ باہمی اتفاق واتحاد۔

بالخصوص دیندار طبقہ تو بزعم خود یہ طے کر چکا ہے کہ اب چودھویں صدی ہے زمانہ رسالت کو بعد ہو چکا، اب اسلام اور مسلمانوں کا انحطاط ایک لازمی شے ہے پس اس کے لئے جدوجہد کرنا عبث اور بیکار ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جس قدر مشکوٰۃ نبوت سے بعد ہوتا جائے گا حقیقی اسلام کی شعاعیں ماند پڑتی جائیں گی لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بقائے شریعت اور حفاظت دین محمدی کے لئے جدوجہد اور سعی نہ کی جائے، اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا اور ہمارے اسلاف بھی خدانخواستہ یہی سمجھ لیتے تو آج ہم تک اس دین کے پہنچنے کی کوئی سبیل نہ تھی البتہ جب کہ زمانہ ناموافق ہے تو رفتار زمانہ کو دیکھتے ہوئے زیادہ ہمت اور استقلال کے ساتھ اس کام کو لے کر کھڑے ہونے کی ضرورت ہے۔

تعجب ہے کہ جو مذہب سراسر عمل اور جدوجہد پر مبنی تھا آج اس کے پیرو عمل سے یکسر

خالی ہیں، حالانکہ قرآن مجید اور حدیث شریف میں جگہ جگہ عمل اور جہد کا سبق پڑھایا اور بتلایا ہے کہ ایک عبادت گذار، تمام رات نفل پڑھنے والا، دن بھر روزہ رکھنے والا، اللہ اللہ کرنے والا ہرگز اس شخص کے برابر نہیں ہوسکتا جو دوسروں کی اصلاح اور ہدایت کی فکر میں بے چین ہو۔

قرآن کریم نے جگہ جگہ جہاد فی سبیل اللہ کی تاکید کی اور مجاہد کی فضیلت اور برتری کو نمایاں کیا۔

لَایَسْتَوِی الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ غَیْرِ اُولِی الضَّرَرِ وَ الْمُجَاهِدُوْنَ فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِیْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَی الْقٰعِدِیْنَ دَرَجَةً وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی وَ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِیْنَ عَلَی الْقٰعِدِیْنَ اَجْرًا عَظِیْمًا دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَ مَغْفِرَةً وَّ رَحْمَةً وَکَانَ اللّٰه غَفُوْرًا رَّحِیْمًا (نساء۔95)

''برابر نہیں وہ مسلمان جو بلا کسی عذر کے گھر میں بیٹھے ہیں اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں اپنے مال و جان سے جہاد کریں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا درجہ بہت زیادہ بلند کیا ہے جو اپنے مال و جان سے جہاد کرتے ہیں بہ نسبت گھر بیٹھنے والوں کے، اور سب سے اللہ تعالیٰ نے اچھے گھر کا وعدہ کر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو بمقابلہ گھر میں بیٹھنے والوں کے اجر عظیم دیا ہے یعنی بہت سے درجے جو خدا کی طرف سے ملیں گے اور مغفرت اور رحمت، اور اللہ بڑی مغفرت، رحمت والے ہیں۔''

اگرچہ آیت میں جہاد سے مراد کفار کے مقابلہ میں سینہ سپر ہونا ہے تاکہ اسلام کا بول بالا ہو اور کفر و شرک مغلوب و مقہور ہو لیکن اگر بدقسمتی سے آج ہم اس سعادت عظمیٰ سے محروم ہیں تو اس مقصد کے لئے جس قدر جدوجہد ہماری مقدرت اور استطاعت میں ہے اس میں تو ہرگز کوتاہی نہ کرنی چاہیے پھر ہماری یہی معمولی حرکت عمل اور جدوجہد ہمیں کشاں کشاں آگے بڑھائے گی۔ وَ الَّذِ یْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا یعنی جو لوگ ہمارے دین کے لئے کوشش کرتے ہیں ہم ان کے لئے اپنے راستے کھول دیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ دین محمدی کی بقاء اور تحفظ کا حق تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے لیکن اس کے عروج و ترقی کے لئے ہمارا عمل اور سعی مطلوب ہے۔ صحابہ کرام ﷺ نے اس کے لئے جس قدر

انتھک کوشش کی اُسی قدر ثمرات بھی مشاہدہ کیے اور غیبی نصرت سے سرفراز ہوئے۔ ہم بھی ان کے نام لیوا ہیں اگر اب بھی ہم ان کے نقش قدم پر چلنے کی کشش کریں اور اعلاء کلمۃ اللہ اور اشاعت اسلام کے لئے کمر بستہ ہو جائیں تو یقیناً ہم بھی نصرت خداوندی اور امداد غیبی سے سرفراز ہوں گے اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَ يُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (سورۃ محمدؐ) ''یعنی اگر تم خدا کے دین کی مدد کے لئے کھڑے ہو جاؤ گے تو خدا تمہاری مدد کرے گا اور تمھیں ثابت قدم رکھے گا''۔

چوتھی وجہ ـــــــ یہ ہے کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جب ہم خود ان باتوں کے پابند نہیں اور اس منصب کے اہل نہیں تو دوسروں کو کس منہ سے نصیحت کریں۔ لیکن یہ نفس کا صریح دھوکا ہے۔ جب ایک کام کرنے کا ہے اور حق تعالیٰ کی جانب سے ہم اس کے مامور ہیں تو پھر ہمیں اس میں پس وپیش کی گنجائش نہیں۔ ہمیں خدا کا حکم سمجھ کر کام شروع کر دینا چاہیے پھر ان شاء اللہ یہی جد و جہد ہماری پختگی، استحکام اور استقامت کا باعث ہوگی اور اسی طرح کرتے کرتے ایک دن تقرب خداوندی کی سعادت نصیب ہو جائے گی۔ یہ ناممکن اور محال ہے کہ ہم حق تعالیٰ کے کام میں جد و جہد کریں اور وہ رحمٰن و رحیم ہماری طرف نظر کرم نہ فرمائے۔ میرے اس قول کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے:

عن انس ﷺ۔ یارسول اللہ لانامر بالمعروف حتی نعمل به کله و لاننهٰی عن المنکر حتی نجتنبه کله فقال ﷺ: بل مروا بالمعروف وان لم تعملوا به کله و انهوا عن المنکرو ان لم تجتنبوه کله (رواه الطبرانی فی الصغیر الاوسط)

''حضرت انس ﷺ سے روایت ہے کہ ہم نے عرض کیا یارسول اللہ! ہم بھلائیوں کا حکم نہ کریں جب تک خود تمام پر عمل نہ کریں اور برائیوں سے منع نہ کریں جب تک خود تمام برائیوں سے نہ بچیں۔ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا نہیں بلکہ تم بھلی باتوں کا حکم کرو اگر چہ تم خود ان سب کے پابند نہ ہو اور برائیوں سے منع کرو اگر چہ تم خود ان سب سے نہ بچ رہے ہو۔''

پانچویں وجہ ـــــــ یہ ہے کہ ہم سمجھ رہے ہیں کہ جگہ جگہ مدارس دینیہ کا قائم ہونا، علماء کا وعظ و نصیحت کرنا، خانقاہوں کا آباد ہونا، مذہبی کتابوں کا تصنیف ہونا، رسالوں کا جاری ہونا، یہ امر

بالمعروف ونہی عن المنکر کے شعبے ہیں اوران کے ذریعہ اس فریضہ کی ادائیگی ہورہی ہے۔اس میں شک نہیں کہ ان سب اداروں کا قیام اور بقاء بہت ضروری ہے اوران کی جانب اعتناء اہم امور سے ہے؛اس لئے کہ دین کی جو کچھ تھوڑی بہت جھلک دکھائی دے رہی ہے وہ انہی اداروں کے مبارک آثار ہیں،لیکن پھر بھی اگر غور سے دیکھا جائے تو ہماری موجودہ ضرورت کے لئے یہ ادارے کافی نہیں اوران پر اکتفاء کرنا ہماری کھلی غلطی ہے اس لئے کہ ان اداروں سے ہم اس وقت منتفع ہو سکتے ہیں جب ہم میں دین کا شوق اور طلب ہو اور مذہب کی وقعت اور عظمت ہو۔اب سے پچاس سال پہلے ہم میں شوق وطلب موجود تھا اور ایمانی جھلک دکھائی دیتی تھی۔اس لئے ان اداروں کا قیام ہمارے لئے کافی تھا لیکن آج غیر اقوام کی انتھک کوششوں نے ہمارے اسلامی جذبات بالکل فنا کر دیے اور طلب ورغبت کے بجائے آج ہم مذہب سے متنفر اور بیزار نظر آتے ہیں۔ایسی حالت میں ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم مستقل کوئی تحریک ایسی شروع کریں جس سے عوام میں دین کے ساتھ تعلق اور شوق ورغبت پیدا ہو اوران کے سوئے ہوئے جذبات بیدار ہوں،پھر ہم ان اداروں سے ان کی شان کے مطابق منتفع ہو سکتے ہیں۔ورنہ اگر اسی طرح دین سے بے رغبتی اور بے اعتنائی بڑھتی گئی،تو ان اداروں سے انتفاع تو درکنار ان کا بقا بھی دشوار نظر آتا ہے۔

چھٹی وجہ ـــــــ یہ ہے کہ جب ہم اس کام کو لے کر دوسروں کے پاس جاتے ہیں تو وہ بری طرح پیش آتے ہیں اور سختی سے جواب دیتے ہیں اور ہماری توہین وتذلیل کرتے ہیں،لیکن ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ کام انبیاء کرام علیہم السلام کی نیابت ہے اوران مصائب اور مشقتوں میں مبتلا ہونا اس کام کا خاصہ ہے اور یہ سب مصائب وتکالیف بلکہ اس سے بھی زائد انبیاء کرام علیہم السلام نے اس راہ میں برداشت کیں۔حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِیْ شِیَعِ الْاَوَّلِیْنَ و مَا یَأْتِیْهِمْ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ (الحجر۔10)

''ہم بھیج چکے ہیں رسول تم سے پہلے اگلے لوگوں کے گروہوں میں اوران کے پاس کوئی رسول نہیں آیا تھا مگر یہ اس کی ہنسی اڑاتے رہے۔''

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: دعوتِ حق کی راہ میں جس قدر مجھ کو اذیت اور تکلیف میں

مبتلا کیا گیا ہے کسی نبی اور رسول کو نہیں کیا گیا۔

پس جب سردار دو عالم اور ہمارے آقا و مولیٰ نے ان مصائب اور مشقتوں کو تحمل اور بُردباری کے ساتھ برداشت کیا تو ہم بھی ان کے پیرو ہیں اور انہی کا کام لے کر کھڑے ہوئے ہیں ہمیں بھی ان مصائب سے پریشان نہ ہونا چاہیے اور تحمل اور بردباری کے ساتھ ان کو برداشت کرنا چاہیے۔

ماسبق سے یہ بات بخوبی معلوم ہوگئی کہ ہمارا اصل مرض روحِ اسلامی اور حقیقت ایمانی کا ضعف اور اضمحلال ہے۔ ہمارے اسلامی جذبات فنا ہو چکے اور ہماری ایمانی قوت زائل ہو چکی اور جب اصل شئے میں انحطاط آ گیا تو اس کے ساتھ جتنی خوبیاں اور بھلائیاں وابستہ تھیں اس کا انحطاط پذیر ہونا بھی لابدی اور ضروری تھا اور اس ضعف و انحطاط کا سبب اس اصل شئے کا چھوڑ دینا ہے جس پر تمام دین کا بقا اور دارومدار ہے اور وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے ظاہر ہے کہ کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کے افراد خوبیوں اور کمالات سے آراستہ نہ ہوں

پس ہمارا علاج صرف یہ ہے کہ ہم فریضۂ تبلیغ کو ایسی طرح لے کر کھڑے ہوں جس سے ہم میں قوت ایمانی بڑھے اور اسلامی جذبات ابھریں، ہم خدا اور رسول کو پہچانیں اور احکام خداوندی کے سامنے سرنگوں ہوں اور اس کے لئے ہمیں وہی طریقہ اختیار کرنا ہوگا جو سید الانبیاء والمرسلین ﷺ نے مشرکین عرب کی اصلاح کے لئے اختیار فرمایا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ..... (الاحزاب۔21)

''بے شک تمہارے لئے رسول اللہ (ﷺ) میں اچھی پیروی ہے.....''

اسی کی جانب امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اشارہ فرماتے ہیں:

لَنْ يُّصْلِحُ اٰخِرَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا مَا اَصْلَحَ اَوَّلَهَا

یعنی اس امت محمدیہؐ کے آخر میں آنے والے لوگوں کی ہرگز اصلاح نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہی طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس نے ابتداء میں اصلاح کی ہے۔

جس وقت نبی کریم ﷺ دعوت حق لے کر کھڑے ہوئے، آپ تنہا تھے، کوئی آپ کا ساتھی اور ہم خیال نہ تھا، دنیوی کوئی طاقت آپ کو حاصل نہ تھی، آپ کی قوم میں خودسری اور خودرائی انتہا درجہ کو پہنچی ہوئی تھی، ان میں سے کوئی حق بات سننے اور اطاعت کرنے پر آمادہ نہ تھا

بالخصوص جس کلمہ حق کی آپ تبلیغ کرنے کھڑے ہوئے تھے اس سے تمام قوم کے قلوب متنفر اور بیزار تھے، ان حالات میں کونسی طاقت تھی جس سے ایک مفلس و نادار، بے یارومددگار انسان نے تمام قوم کو اپنی طرف کھینچا۔ اب غور کیجیے کہ آخر وہ کیا چیز تھی جس کی طرف آپ نے مخلوق کو بلایا اور جس شخص نے اس چیز کو پالیا وہ پھر ہمیشہ کے لئے آپ کا ہو رہا۔ دنیا جانتی ہے کہ وہ صرف ایک سبق تھا۔ جو آپ کا مطمح نظر اور مقصود اصلی تھا جس کو آپ نے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (ال عمران۔64)

''بجز اللہ تعالیٰ کے ہم کسی اور کی عبادت نہ کریں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی دوسرے کو رب نہ قرار دے خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر۔''

اللہ وحدہ لاشریک لہ کے سوا ہر شئے کی عبادت اور اطاعت اور فرماں برداری کی ممانعت کی اور اغیار کے تمام بندھنوں اور علاقوں کو توڑ کر ایک نظامِ عمل مقرر کر دیا اور بتلا دیا کہ اس سے ہٹ کر کسی دوسری طرف رخ نہ کرنا۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِنْ رَّبِّكُمْ وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖ اَوْلِيَآءَ (الاعراف۔3)

''تم لوگ اس کا اتباع کرو جو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے آئی ہے اور خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسرے لوگوں کا اتباع مت کرو۔''

یہی وہ اصل تعلیم تھی جس کی اشاعت کا آپ کو حکم دیا گیا:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ (النحل۔ 125)

''اے محمدؐ! بلاؤ لوگوں کو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور نیک نصیحت سے اور ان کے ساتھ بحث کرو جس طرح بہتر ہو، بے شک تمہارا رب ہی خوب جانتا ہے اس شخص کو جو گمراہ ہو اس کی راہ سے، وہی خوب جانتا ہے راہ چلنے والوں کو۔''

اور یہی وہ شاہراہ تھی جو آپ کے لئے اور آپ کے ہر پیرو کے لئے مقرر کی گئی:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ وَ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ مَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (یوسف۔108)

''کہہ دو یہ ہے میرا راستہ، بلاتا ہوں اللہ کی طرف سمجھ بوجھ کر، میں اور جتنے میرے تابع ہیں وہ بھی، اور اللہ پاک ہے، اور میں شریک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔''

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَ عَمِلَ صَالِحًا وَّ قَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (حٰم سجدہ۔ 33)

''اور اس سے بہتر کس کی بات ہوسکتی ہے جو خدا کی طرف بلائے اور نیک عمل اور کہے میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔''

پس اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی مخلوق کو بلانا، بھٹکے ہوؤں کو راہ حق دکھلانا، گمراہوں کو ہدایت کا راستہ دکھلانا نبی کریم ﷺ کا وظیفہ حیات اور آپ کا مقصد اصلی تھا اور اسی مقصد کی نشوونما اور آبیاری کے لئے ہزاروں نبی اور رسول بھیجے گئے۔

وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (الانبیاء۔ 25)

''اور ہم نے نہیں بھیجا تم سے پہلے کوئی رسول مگر اس کی جانب یہی وحی بھیجتے تھے کہ کوئی معبود نہیں بجز میرے، پس میری بندگی کرو۔''

نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کے مقدس لمحات زندگی پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سب کا مقصد اور نصب العین صرف ایک ہے، اور وہ اللہ رب العالمین وحدہ لاشریک لہ کی ذات وصفات کا یقین کرنا، یہی ایمان اور اسلام کا مفہوم ہے اور اسی لئے انسان کو دنیا میں بھیجا گیا۔ وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ یعنی ہم نے جنات اور انسان کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ بندہ بن کر زندگی بسر کریں۔ اب جب کہ مقصد زندگی واضح ہو گیا اور اصل مرض اور اس کے معالجہ کی نوعیت معلوم ہو گئی تو طریق علاج کی تجویز میں زیادہ دشواری پیش نہ آئے گی اور اس نظریے کے ماتحت جو بھی علاج کا طریقہ اختیار کیا جائے گا

ان شاءاللہ نافع اور سودمند ہوگا۔

تبصرۂ کتب

نام کتاب: **چہرے کا پردہ ـــــ واجب، مستحب یا بدعت**

مؤلف: حافظ محمد زبیر ضخامت: 208 صفحات

قیمت: 150 روپے

ناشر: مکتبہ رحمۃ للعالمین، نذیر پارک، غازی روڈ لاہور

اسلام کی پاکیزہ تعلیمات کا ایک عکس جمیل ہر صحیح الفطرت انسان کے قلب و ذہن پر کندہ ہوتا ہے اور کوئی شخص بقائمی ہوش وحواس اس سے آنکھیں نہیں چراتا۔ مسلمانوں کے اجتماعی شعور میں ان تعلیمات کی ایک ایسی چھاپ اب بھی موجود ہے جو عصر حاضر کے مغربی فتنوں اور ثقافتی یلغار کے باوجود ابھی تک قائم ہے ایک ایسا مسلمان جو کبھی مسجد نہیں جاتا اس سے بھی پوچھ لیا جائے کہ اسلام کی تعلیمات کیا ہیں؟ تو وہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، سچ بولنا، حلال کمانا، کسی پر ظلم وزیادتی نہ کرنا، بدکاری و بے حیائی سے دور جانا، عورتوں کا برقع پہننا اور غیر مردوں سے میل ملاپ سے اجتناب کرنا جیسے معاملات گنوادے گا۔ مگر ـــــــــ دین دار لوگ جو مسجدوں سے ربط ضبط رکھتے ہیں اور قرآن وسنت پر نظر بھی ـــــــــ وہ نامعلوم کیوں ان باتوں میں بحث وتمحیص کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ خواتین کے لئے گھر سے باہر نکلتے وقت غیر محرموں کے سامنے، چہرے کا پردہ بھی اسلام کی فطری تعلیمات کا حصہ ہے۔ جسے آج مغربی تہذیبی وثقافتی یلغار کے باعث آزادئ نسواں کے نام پر بعض دانشور حضرات موضوع بحث بنا کر متنازعہ بنانے کے درپے ہیں۔

برادرم حافظ زبیر صاحب نے زیر تبصرہ کتاب میں اس بنیادی بات کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اور وقیع معلومات کو یکجا کر دیا ہے جو موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے ایک اثاثہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو خواتین وحضرات بھی دینی لحاظ سے سرگرم ہوں اور دل میں اس موضوع پر کوئی خلش رکھتے ہوں ان حضرات کے لئے اس کتاب کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔ ہمارے نزدیک اس کتاب میں ایک تقریظ کے انداز میں ایک باب کا اضافہ کر دیا جائے کہ اسلام کی ہمہ گیر پاکیزہ تعلیمات کے PERSPECTIVE میں عورت کے بارے میں گھر سے نکلتے وقت جو بعض احکام دیے گئے ہیں اُن کا اصل پس منظر کیا ہے؟ تو کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو جائے گا اور ایک درمیانے درجے کا تعلیم یافتہ قاری بھی اس سے استفادہ کر سکے گا۔ کتاب سفید کاغذ پر اعلیٰ طباعت اور خوبصورت چار رنگہ ٹائٹل کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔

اِنّا لِلّٰہِ واِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

سانحۂ ارتحال بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

حکمت بالغہ کا حالیہ شمارہ پریس میں بھجوانے کے لئے تیار تھا کہ تنظیم اسلامی پاکستان کے بانی ڈاکٹر اسرار احمد کے سانحۂ ارتحال کی خبر موصول ہوگئی۔ مرحوم 14 اپریل 2010ء بمطابق 28 ربیع الثانی 1431ھ بروز بدھ بعمر 78 سال اس جہانِ فانی سے انتقال فرما کر خاک ارضی میں آسودۂ خواب ہوگئے۔ اِنّا لِلّٰہِ واِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

ڈاکٹر صاحب دنیاوی تعلیم کے لحاظ سے ایم بی بی ایس تھے۔ بعد ازاں ایم اے اسلامیات کا امتحان اوّل پوزیشن میں پاس کیا۔ شعوری زندگی کے آغاز ہی سے قرآن فہمی اور دینی علوم سے دلچسپی تھی۔ زیادہ وقت قرآن حکیم کے درس و تدریس میں صرف کرتے تھے۔ شروع میں کچھ وقت میڈیکل پریکٹس بھی کی لیکن پھر اسے ترک کر کے ہمہ وقت دین کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ 1955ء میں جماعت اسلامی کے رکن بنے مگر دو سال بعد ایک اصولی اختلاف کے باعث جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ قرآنی تعلیمات کی نشر و اشاعت کے لئے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور قائم کی۔ 1975ء میں نفاذ شریعت اور اقامت دین کی جدوجہد کے لئے تنظیم اسلامی کی بنیاد رکھی۔ موصوف اس لحاظ سے بہت خوش قسمت تھے کہ آپ کے بھائی، بیٹے، بیٹیاں اور دیگر قریبی عزیز و اقارب سبھی آپ کے دینی فکر سے متفق تھے اور تنظیم اسلامی میں آپ کے معاون اور رفیق تھے۔ آپ نے اس دنیاوی زندگی کے آخری لمحات تک جسم و جان کی صلاحیتوں کو دین کی خدمت میں صرف کیا اور ایک کثیر تعداد میں لوگوں کو قرآن کی طرف متوجہ کر کے صراطِ مستقیم پر گامزن کیا۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ مرحوم کی کوتاہیوں اور لغزشوں سے درگزر فرما کر ان کی دینی خدمات کو شرفِ قبولیت بخشے اور انہیں اخروی کامیابی سے نوازے۔ خداوند کریم مرحوم کے پسماندگان اور عقیدتمندوں کو اس صدمے پر صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ آمین

(پروفیسر خلیل الرحمٰن)